منظر فارقی، متوسط، کاغذ کتابت وطباعت اچھی صفحات ۲۰۰، قیمت عـہ
مصنف سے قصبہ رودلی، ضلع بارہ بنکی سے ملے گی۔

حضرت مخدوم احمد عبدالحق ردولوی آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے مشہور بزرگ گذرے ہیں۔ ان کا ذکر تذکروں میں ملتا تو ہے، مگر اس سے تفصیلی معلومات حاصل نہیں ہوتی ہیں، اس لیے ابھی تک ان کی کوئی مبسوط سوانح عمری نہیں لکھی گئی ہے، زیر نظر کتاب میں ان کے حالات وکمالات، سیرت واخلاق، سیر وسیاحت، طریقۂ رشد واصلاح کے علاوہ بعض ممتاز خلفا اور ان کے سلسلہ کے کئی نامور بزرگوں کا مختصر تذکرہ ہے، خانقاہ اور عرس کی مروجہ رسموں اور طریقت وخاندان کے شجرے بھی تحریر کئے گئے ہیں، آخر میں مخدوم صاحب کے خاندان کے موجودہ صدی کے بعض نامور اشخاص کا مختصر حال دیا گیا ہے، مصنف اسی خانوادہ کے چشم وچراغ ہیں اس لئے اس میں عقیدت مندانہ رنگ زیادہ نمایاں ہو گیا ہے گو اس کتاب کے سب واقعات کو مستند نہیں کہا جاسکتا، تاہم مخدوم صاحب اور ان کے سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے بارہ میں جو مفید معلومات تحریر کئے گئے ہیں، ان سے آیندہ سوانح نگار کو مستند اور غیر مستند باتوں کی چھان بین میں مدد مل سکتی ہے۔

آئینے کے سامنے:- مرتبہ جناب مبشر علی صدیقی صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت معمولی صفحات ۱۱۰، قیمت للعہ پتہ مبشر علی صدیقی، گلی وحید بخش محلہ سوتھ بدایوں۔

جناب مبشر علی صدیقی کے پندرہ ۱۵ ہلکے پھلکے ادبی وتنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ تین حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ میں سرسید احمد اور ان کے ہمعصر دوسرے نامور مصنفین مولانا شبلی، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا حالی اور عبدالحلیم شرر کے ادبی پہلوؤں پر چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں، اسی حصہ میں اقبال کے فلسفہ شاعری کے متعلق ایک دلچسپ مکالمہ بھی ہے، دوسرے حصہ میں مصنف نے اپنے وطن بدایوں کے بعض شاعروں اور وہاں کے نظامی پریس سے شائع ہونے والے دیوان غالب کے مختلف ایڈیشنوں کی خصوصیات تحریر کی ہیں، تیسرے حصہ میں بعض نئی ادبی کتابوں پر ریویو ہے، مصنف کی تحریر میں متانت اور خیالات میں توازن ہے، اور یہ مضامین طلبہ کے استفادہ کے لائق ہیں۔ "ض"

جلد ۱۱۶ ماہ ستمبر ۱۹۷۵ء مطابق ماہ رمضان المبارک ۱۳۹۵ھ عدد ۳

مضامین

مقالات

بابُ التقریظ والانتقاد

شذرات

اس وقت ملک ایک بڑے انقلاب کے دور سے گذر رہا ہے، حالات جس تیزی سے بدلے اور بدلتے جارہے ہیں، اس کا چند برس پہلے کوئی اندازہ بھی نہیں کرسکتا تھا، بڑے بڑے جہاندیدہ اور دوربین مبصروں نے آئندہ واقعات کا جو تصور قائم کیا تھا، وہ بالکل بے حقیقت ثابت ہوا، ماضی میں لگائے ہوئے اندازے ایسے بدل گئے کہ پرانے نقشے تقویم پارینہ معلوم ہونے لگے، حالات برابر نیا رنگ اختیار کرتے جارہے ہیں، اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کل کیا ہوگا، ملک کی تعمیر نو کا پورا نقشہ تو ابھی سامنے نہیں آیا ہے، مگر آہستہ آہستہ جو خطوط ابھر رہے ہیں، ان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تبدیلیوں کا یہ سلسلہ ابھی جاری رہے گا، معیشت و سیاست اور تہذیب و معاشرت کی نئی طرحیں پڑیں گی، اور قدم برابر جدید سے جدید تر کی طرف اٹھتے رہیں گے، ماضی کی یادیں کتنی ہی خوشگوار اور عہد رفتہ کے نظارے کیسے ہی مسرت افروز ہوں، ہمارا دل کتنا ہی چاہے کہ لیت الزمان یعود اور ہم عمر رفتہ کو کتنی ہی آوازیں دیں، لیکن اب نہ پرانی غزل چھڑ سکتی ہے، نہ ساز کہن ہاتھ میں دیا جاسکتا ہے،

اس عہد انقلاب میں یوں تو ملک کے سبھی باشندوں کو اپنے حالات کا جائزہ لینا ہے، لیکن مسلمانوں کو خصوصیت کے ساتھ اس صورت حال پر غور کرنا ہے کہ ان کے لئے قیادت میں تبدیلی، اور پارٹیوں کا رد و بدل بے سود ہے، وہ تمام سیاسی جماعتوں کا تجربہ کرچکے ہیں، انھیں اچھی طرح یہ معلوم ہوچکا کہ "الف" ہو یا "ب"، "ج" ہو یا "د"، ان میں کوئی ان کے درد کی دوا نہیں ہے، انھوں نے مختلف پارٹیوں کا ساتھ دیا، بہتوں کو تخت حکومت تک پہنچایا، بہتوں کے جلوس نکالے، اور ان کی شان میں قصیدے پڑھے،

لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا، وہ پیاس کی شدت میں چمکتی ہوئی ریت کی طرف دوڑتے رہے، لیکن سراب سے پیاس کہاں بجھ سکتی تھی، ان کی حلق سوکھتی رہی، اور جان لبوں پر آگئی، مگر ان کے نام نہاد دوستوں نے پانی کی ایک بوند بھی ان کی حلق میں ٹپکانے کی کوشش نہیں کی،

پرانے زمانہ میں جب کسی کو کوئی جلوس نکالنا ہوتا تھا، تو فیل خانہ سے ہاتھی نکال کر لائے جاتے تھے، ان پر زرتار جھولیں ڈالی جاتی تھیں، تاکہ ان کے جلوس کی شان بڑھے، اور اس کی رونق دوبالا ہوجائے، مگر جب جلوس نکل چکتا تھا تو زریں جھولیں اور مرصع عماریاں اتار کر انھیں پھر فیل خانہ میں بند کردیا جاتا تھا، یہی سلوک مسلمانوں کے ساتھ مختلف پارٹیوں کا رہا ہے، ان سے اپنے جلوس کی رونق بڑھائی ہے، لیکن اس کے بعد پھر کسی نے ان کی خبر نہیں لی، شاعروں کے روایتی معشوق تو قتل کے بعد جفا سے تائب ہوجاتے تھے، مگر ان سیاسی محبوبوں کو کبھی اس کی بھی توفیق نہیں ہوئی، ہماری وفا خطا سمجھی گئی، اور ناکردہ گناہوں کی سزا ملتی رہی، غالب نے تو انداز گفتگو کی شکایت بھی کی تھی، مگر ہم نے تسلیم و رضا کی خو نہیں چھوڑی، اور گالیاں کھا کر بھی بدمزہ نہ ہوئے، مگر مزاج یار ہمیشہ برہم ہی رہا،

ماضی کے یہ تجربے ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہیں، عقل کا تقاضا ہے کہ ہم خود اپنے حالات پر غور کریں، گزشتہ تجربوں سے فائدہ اٹھائیں، زمانہ کی نبض پر ہاتھ رکھیں، وقت کے تقاضوں کو سمجھیں، طوفان کی شدت کا اندازہ کریں، اور منجدھار میں ڈالنے سے پہلے اپنی کشتی کے کل پرزوں کو دیکھ لیں، اس کے تختوں کو ٹھوک بجا کر پرکھ لیں، اور خوب سوچ سمجھ کر ایسا فیصلہ کریں کہ ہمارا حال بہتر ہوجائے، اور ہم اپنی آئندہ نسلوں کو اس سے بہتر مستقبل کا یقین دلا سکیں،

ہمیں مادی خوشحالی، اور فارغ البالی بھی درکار ہے، اور روحانی سکون و اطمینان بھی، لیکن اگر ہم ایک باعزت اور پُروقار قوم کی طرح زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی خودی کی نگہبانی کرنا پڑے گی، اور دریوزہ گری کی وہ خو چھوڑنا پڑے گی، جو مدتوں سے ہمارا شعار ہے، عرصہ سے ہم نے اپنے آپ کو نیلامی مال بنا رکھا ہے، کہ جو زیادہ بولی بول دے، لے جائے، ہمیں اب یہ طرزِ عمل ترک کرنا چاہئے، حقوق نہ مانگنے سے ملتے ہیں، نہ دستاویزوں سے اُن کی حفاظت ہوتی ہے، ہمیں اپنے اندر وزن پیدا کرنا چاہئے، راکھ کے ڈھیر ہوا کے ایک جھونکے میں اُڑ جاتے ہیں، لیکن طوفانی جھکڑ بھی چٹانوں میں جنبش نہیں پیدا کر سکتے، ہمیں ہمیں گنتی کے پھیر میں نہیں پڑنا چاہئے بلکہ اپنے اندر وہ اوصاف پیدا کرنے چاہئیں کہ محبوب خلائق اور سرتاج عالم بن جائیں،

معارف کے قارئین مولانا ابو الوفا افغانی کے نام اور کام سے بخوبی واقف ہیں، اُن کی پیدائش افغانستان میں ہوئی، لیکن تعلیمی مراحل ہندوستان میں طے ہوئے، اور یہاں کے باکمال اساتذہ سے استفادہ کیا، زندگی کا بڑا حصہ حیدرآباد میں گزرا، عرصہ تک مدرسہ نظامیہ میں درس رہے، فقہ حنفی سے خاص مناسبت تھی، اور امام ابو حنیفہؒ ان کے تلامذہ اور ائمۂ احناف سے بڑی عقیدت تھی، لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ اُن کی اس عقیدت کی گواہ ہے، انھوں نے قاضی ابو یوسف امام محمد اور شمس الائمہ سرخسی کی کتابیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جمع کیں، بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ مختلف نسخوں کا مقابلہ کیا، جا بجا ہی کے ساتھ ان کی تصحیح کی، حواشی لکھے انڈکس بنائے اور حسن و خوبی کے ساتھ طباعت کا انتظام کیا، وہ پرانے مدرسوں کے پڑھے ہوئے تھے لیکن نئے محققین بھی اُن کا لوہا مانتے تھے، افسوس کہ گزشتہ ماہ علم و تحقیق کی یہ شمع خاموش ہو گئی، اللہ تعالیٰ اُن کو اپنی رحمتوں سے سرفراز فرمائے، اور اُن کے بیش بہا کاموں کے جاری رکھنے کا انتظام فرمائیے،

مقالات

دیار پورب کا تیسرا علمی دور

از مولانا قاضی اطہر مبارک پوری، اڈیٹر البلاغ، بمبئی

دیار پورب کا تیسرا علمی دور قیام سلطنت تیموریہ ۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء سے ۱۱۳۰ھ / ۱۷۱۸ء تک ہے اس دو سو سالہ مدت میں ہندوستان کے مختلف دیار و امصار کی طرح دیار پورب میں بھی بہت سے علمی و دینی مرکز پورے انبساط و نشاط کے ساتھ اپنے اپنے حلقوں میں کام کرتے رہے، کہنا چاہئے کہ گذشتہ دونوں ادوار کے حسنات و برکات تیسرے دور میں پوری طرح کھل کر سامنے آگئے تھے، اور اس دیار کے قصبات و قریات علم و علماء کی کثرت اور سرگرمی کی وجہ سے ہرات و نیشاپور معلوم ہوتے تھے، اور اس دور کے پانچویں سلطان شہاب الدین محمد شاہجہاں کی زبان سے بے ساختہ یہ جملہ نکلا کہ "پورب شیراز ماست"۔

تیموری سلطنت کا قیام اس سے پہلے لودھی دور مختصر ہونے کے ساتھ بڑا پُرفتن تھا، پورے ملک میں جگہ جگہ راجے، مہاراجے اور زمیندار سر اٹھا رہے تھے، آخر میں خود لودھی حکمرانوں میں اندرونی انتشار و خلفشار اور طوائف الملوکی کی حالت برپا تھی، آخری بادشاہ ابراہیم لودھی کے دور میں یہ سلطنت تقریباً دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی، اس کے بھائی جلال الدین

لودی نے جونپور میں اپنی حکومت قائم کرلی تھی، اور ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ پچاس سال کے بعد جونپور میں شرقی سلطنت کی طرح ایک نئی سلطنت قائم ہونے والی ہے۔ مگر سلطان ابراہیم لودی نے جلال الدین لودی سے جنگ کرکے اس کو گوالیار بھاگنے پر مجبور کردیا، اور بعد میں گرفتار ہوکر قتل کردیا گیا،

بھائی کے فتنے سے نجات پانے کے بعد سلطان ابراہیم لودی کو بابر سے مقابلہ کرنا پڑا، جس نے پانی پت کے میدان میں اسے شکست دے کر ۹۳۲ھ/۱۵۲۶ء میں تیموری سلطنت کی بنیاد رکھی، جسے مغل سلطنت بھی کہتے ہیں، دہلی پر تیموری قبضہ کے بعد دیارِ پورب بھی اس کے زیر تصرف آگیا، اور اسی دور سے گویا یہ علاقہ شیرازِ ہند بن گیا، تیموری سلطنت کے اقبال مند سلاطین جن کے دور میں علم و فن کی بہار شباب پر رہی، یہ ہیں، (۱) ظہیرالدین محمد بابر متوفی ۹۳۷ھ/۱۵۳۰ء (۲) نصیرالدین محمد ہمایون متوفی ۹۶۳ھ/۱۵۵۵ء، (۳) جلال الدین محمد اکبر متوفی ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء (۴) نورالدین محمد جہانگیر متوفی ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء (۵) شہاب الدین محمد شاہجہاں متوفی ۱۰۹۸ھ/۱۶۶۳ء، (۶) محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر متوفی ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء (۷) شاہ محمد معظم بہادر شاہ ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۱ء، (۸) محمد معزالدین جہاندار شاہ الخ

سلطان محمد عالمگیر کے بعد اگرچہ اس خاندان میں کئی بادشاہ گذرے ہیں مگر انکی حیثیت دورِ خزان کے بے رنگ و بو پھولوں کی ہے، ہر دورِ سلطنت میں دیارِ پورب پر اسکے کسی ایک بادشاہ نے خصوصی توجہ دیکر اسے گلزارِ علم بنایا، مگر تیموری دور میں دو بادشاہوں نے یہاں کے چمن کی رکھوالی کی جس طرح تغلق دور میں سلطان فیروز شاہ تغلق، شرقی دور میں سلطان ابراہیم شاہ شرقی اور لودی دور میں سلطان سکندر شاہ لودی اس بارے میں نمایاں ہیں، اسی طرح تیموری دور میں یہ سہرا سلطان جہانگیر اور سلطان شاہجہان

دونوں کے سر ہے،

واضح ہو کہ صوبہ الہ آباد، اور صوبہ اودھ اور صوبہ عظیم آباد تینوں کے مجموعہ کو ملک پورب کہا جاتا تھا اور تینوں علاقوں میں مسجدیں، مدارس، خانقاہیں، ارباب علم و فن اور علماء و مشائخ سے آباد تھیں، البتہ ان میں صوبۂ الہ آباد اور صوبہ اودھ تیموری عہد میں جداگانہ شان رکھتے تھے، پھر ان دونوں میں صوبۂ اودھ کو نمایاں حیثیت حاصل تھی، پورے تیموری دور میں دیارِ پورب کی علمی سرگرمی کا نقشہ مولانا غلام علی آزاد نے ان الفاظ میں کھینچا ہے، ان کو اس دور کا آئینہ کہنا چاہئے،

واما صوبہ اودھ و صوبہ الہ آباد خصوصیتے
دارد کہ در ہیچ صوبہ نتوان یافت، چہ تمام صوبہ
اودھ و اکثر صوبہ الہ آباد بہ فاصلہ پنج کروہ
نہایت دہ کروہ تخمیناً آبادئ شرفا و نجباً
است کہ از سلاطین و حکام وظائف و
زمین مدد معاش داشتہ اند و مساجد و مدارس
و خانقاہات بنا نہادہ و مدرسان عصر در
ابواب علم بر روئے دانش پژوہان کشادہ
و صدائے "اطلبوا العلم" در دادہ، و طلبہ
خیل خیل از شہرے بہ شہرے می روند و ہر جا
موافقت دست بہم داد بہ تحصیل مشغول
می شوند، و صاحب توفیقان ہر معمورہ

اودھ اور الہ آباد کے دونوں صوبے خصوصی حیثیت رکھتے ہیں، جو کسی اور صوبہ میں نہیں مل سکتی ہے، کیونکہ پورا صوبہ اودھ اور صوبہ الہ آباد کا اکثر علاقہ پانچ دس کوس کے فاصلہ میں شرفاء کی آبادی پر مشتمل ہے، جو سلاطین و حکام کی طرف سے وظائف اور جاگیر رکھتے ہیں، اور ان میں مسجدوں مدرسوں اور خانقاہوں کی کثرت ہے، ہر جگہ مدرسین و معلمین طلبۂ علوم کے لئے اپنے دروازے کھلے رکھتے ہیں، اور انکو علم کی دعوت دیتے ہیں، جس کے سبب طلبۂ علوم جماعت در جماعت ایک بستی سے دوسری بستی میں آتے جاتے ہیں،

طلبۂ علم را نگاہ می دارند، و خدمت این جماعت را سعادت عظمیٰ می دانند صاحب قرانِ ثانی شاہجہان انار اللہ برہانہ می گفت،

"پورب شیراز ماست"[1]

اور ہر جگہ سکون و اطمینان سے علم حاصل کرتے ہیں، ہر بستی کے مستطیع لوگ طالب علموں کا پورا پورا خیال کرتے ہیں، اور ان کی خدمت کو سعادت عظمیٰ سمجھتے ہیں، اس لیے شاہ جہان بادشاہ کہا کرتے تھے کہ پورب ہمارا شیراز ہے۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مغل دور میں پورا ملک پورب بشمولیت صوبہ الٰہ آباد وصوبہ اودھ وصوبہ عظیم آباد، علم و علماء سے معمور تھا، لیکن صوبہ الہ آبا اور اودھ کی علمی و دینی رونق کچھ اور ہی تھی، خاص طور سے صوبہ اودھ معدن علم و فن اور مرکز علماء و فضلاء تھا،

آزاد بلگرامی کے اس بیان سے دیار پورب اور اطراف جونپور کی عام علمی و دینی سرگرمی اور عام مسلمانوں کے علمی و دینی ذوق و شوق کا پتہ چلتا ہے، اور مولانا خیر الدین محمد جونپوری کے بیان سے معلوم ہوتا کہ مغل سلاطین امراء اور شاہزادے اس دیار کی علمی سرگرمی سے کس قدر دلچسپی رکھتے تھے، اور علمائے پورب سے ان کو کتنی عقیدت و محبت تھی، وہ لکھتے ہیں۔

القصہ شہر جونپور از عہد سلطان فیروز شاہ تا آخر سلطنت محمد شاہ کہ خاتم السلاطین است، در ہر طبقہ مجمع فضلاء و مرجع طلبہ بود، پیوستہ فرامین سلاطین بحکام جونپور جہت تعظیم و توقیر علماء و مشائخان می رسید

شہر جونپور سلطان فیروز شاہ کے عہد سے لیکر خاتمۃ السلاطین محمد شاہ کی سلطنت تک ہر طبقہ کے فضلاء کا مجمع اور طلبہ کا مرجع تھا، علماء و مشائخ کی تعظیم و توقیر کیلئے سلاطین زمانہ کے فرامین حکام جونپور کے

[1] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۲۱ و ۲۲۲،

صدر، و بخشی جہت محافظت مدد معاش و حفظ مراتب آن بزرگان مامور می گردیدند، و وقائع نگار کہ از حضور سلاطین جہت ترقیم سوانح جونپور مقرر می شدند، در ہر مدرسہ و خانقاہ حاضر شدہ کوائف ہر مدرسہ و خانقاہ دریافتہ می نوشتند بادشاہانِ عہد بعد ادراک مداخل و مخارج ہر مدرس و مشائخ بقدر حال در وظائف و تعطاعات او می افزودند شاہزادہا و امرا کہ ازین طرف می گذشتند صرف برائے استرضائے سلاطین معتقدانہ در ہر مدرسہ و خانقاہ حاضر می شدند و نذر فراوان می گذرانیدند،[2]

پاس پہونچا کرتے تھے، ان بزرگوں کے درجات و مراتب اور معاشی امداد کی حفاظت کے لیے صدر اور بخشی مقرر کیے جاتے تھے، جو وقائع نگار سلاطین کی طرف سے جونپور کے حالات لکھنے پر مامور ہوتے تھے، وہ ہر مدرسہ اور خانقاہ مین خود حاضر ہو کر ان کے حالات خود معلوم کرتے اور لکھتے تھے، اور سلاطین ہر مدرس اور مرشد کے آمد و خرچ کی تفصیل معلوم کر کے ان کے وظائف اور جاگیر میں بقدر ضرورت اضافہ کرتے تھے، نیز جو شاہزادے اور امراء اس دیار سے گذرتے تھے، بادشاہوں کی خوشنودی کے لیے ہر مدرسہ اور خانقاہ میں حاضر ہو کر زیادہ سے زیادہ نذر پیش کرتے تھے،

اس بیان کا لفظ لفظ بتا رہا ہے کہ تیموری سلاطین و امراء اور شاہزادے اس دیار کے گلشن علم و فضل کو اپنی بے حساب محبت و عقیدت سے پر بہار رکھتے تھے، اور ان کے دور میں یہ علاقہ واقعی دار العلم و العلماء" تھا، اب ہم ہر تیموری بادشاہ کے دور میں پورب خاص طور سے اودھ اور اطراف جونپور کی علمی سرگرمی کو بیان کرتے ہیں، اور مختصر طور سے اس کا جائزہ لیتے ہیں،

[2] تذکرۃ العلماء ص ۵

جس میں زیادہ مثالیں علماء و سلاطین کے باہمی تعلقات کی ہیں،

سلطان محمد بابر (۹۳۲ھ ۱۵۲۶ء تا ۹۳۷ھ ۱۵۳۰ء) | تیموری سلطنت کا بانی دہوسس بابر شاہ جمادی الاخریٰ

۹۳۲ھ میں سلطان ابراہیم لودی کو قتل کر کے خود بادشاہ بنا، وہ کامیاب حکمران اور سیاست داں ہونے کے ساتھ نہایت ستھرا علمی ذوق رکھتا تھا، اور علوم و معارف کا قدرداں تھا، فارسی اور ترکی کا شاعر تھا، اس نے متعدد کتابیں لکھیں، تصوّف کی ایک کتاب منظوم کی، تزک بابری لکھی اور فقہ حنفی میں مُبَیَّن کے نام سے ایک کتاب لکھی جس کی شرح شیخ زین الدین خانی نے مُبَیَّن کے نام سے تحریر کی، علاقہ ترکستان کے مہاجرین سے معلوم ہوا ہے کہ یہ کتاب آج بھی تاشقند اور دیگر بلادِ ماوراء النہر میں پڑھائی جاتی ہے، اس نے خط بابری ایجاد کیا اور اسی خط میں قرآن شریف لکھکر مکہ مکرمہ روانہ کرتا تھا، سات سال حکومت کر کے جمادی الاولیٰ ۹۳۷ھ ۱۵۳۰ء میں فوت ہوا، بابر اور ہمایوں کے دور کے علماء "مُخَضرَم الدولتین" تھے یعنی انھوں نے لودی اور تیموری دونوں سلطنتوں کو پایا تھا، اور حکومتوں کے انقلاب و تغیر میں ان کی بزم علم و مشیخت برابر قائم رہی، ساتھ ہی بابر شاہ ان کی طرف سے غافل نہیں رہا، اور پورے ملک کے علماء و مشائخ کی طرح بلاد پورب کے اہل علم و فضل بوقت ضرورت اسکی نگاہ التفات کے مستحق بنے، چنانچہ مفتی آدم بن محمد حنفی گوپا مئو متوفی ۱۰۰۱ھ کو بابر شاہ نے ایک گاؤں جاگیر میں دیکر معاش کی طرف سے بے فکر کر دیا تھا، مفتی آدم نے جونپور میں شیخ معروف بن عبد الواسع حسینی جونپوری سے علم و طریقت کی تعلیم پائی اور گوپا مئو میں رہ کر افتاء و تدریس میں زندگی بسر کی، ابتداء ہی میں بابر شاہ نے ان کو جاگیر دیکر دینی اور علمی خدمت کے لئے فارغ کر دیا تھا،[1]

[1] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۴

سلطان محمد ہمایوں (۹۳۷ھ ۱۵۳۰ء تا ۹۶۳ھ ۱۵۵۵ء) | بابر کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں بادشاہ ہوا، اس نے اولیں فرصت میں جونپور کو محمود لودی کے قبضہ سے نکال کر اپنی سلطنت میں شامل کیا، اور کہنا چاہئے کہ اس کے بعد یہ علاقہ تیموری سلطنت کا باقاعدہ حصہ بنا، اس مہم کے لیے ہمایوں خود جونپور گیا، ۹۴۶ھ میں بہار گیا، اور شیر خان سے جنگ میں ناکام رہا، ۹۴۷ھ میں اس کے مقابلہ میں دوبارہ ہزیمت اٹھائی، اور لاہور، سندھ، ہرات، مشہد ہوتا ہوا قزوین جاکر طہماسپ شاہ صفوی سے مدد چاہی۔

اسوقت تک تیموری سلطنت پر پندرہ سال گذر چکے تھے، اور یہاں علماء و فضلاء اور مدارس کی کثرت کا یہ حال تھا کہ ان کے تذکرہ سے شیراز و اصفہان کے علماء و فضلاء کا ستارۂ اقبال چمک اٹھا، مولوی خیر الدین محمد نے جونپور نامہ اور تذکرۃ العلماء میں ملا محمد اصفہانی کی کتاب سیر الملوک کے حوالہ سے لکھا کہ

شہنشاہ ایران طہماسپ مرحوم از سلطان الہند ہمایوں، در نخستین ملاقات از فضلائے جونپور پرسید، دبا دراک کثرت دانبوہ علماء در آن دیار بر ویرانئ شہر شیراز متحیر گردیدہ ہماں روز کارپردازان سلطنت جہت تاسیس مدارس شیراز و تعظیم و توقیر علمائے آں شہر فرمان داد، در شہر اصفہان و حوالی آں نیز مدارس و خانقاہات بنا نمود و علماء را تعلیم و تدریس طالبان مامور فرمود[1]

سلطان ہند ہمایوں سے شہنشاہ ایران طہماسپ نے پہلی ہی ملاقات میں فضلائے جونپور کے بارہ میں سوال کیا، اور وہاں کے علماء کی کثرت کو معلوم کر کے شیراز کی ویرانی پر حیران ہوگیا اور اسی دن کارکنان سلطنت کو اس شہر کے مدرسوں کی تاسیس اور وہاں کے علماء کی تعظیم و توقیر کا فرمان جاری کیا، اصفہان اور اسکے اردگرد کے مقامات میں بھی اس نے مدرسوں اور خانقاہوں کی تعمیر کر کے علماء کو درس و تدریس

[1] تذکرۃ العلماء ص ۴ و جونپور نامہ قلمی ص ۴ (دار المصنفین اعظم گڈھ)

دیار جونپور کی یہ علمی و دینی بہار شرقیوں اور لودیوں کے ادوار سے گذر کر تیموریوں کے دور میں آئی تو اس قدر پُر کیف اور وجد آفریں تھی، کہ فزدین و شیراز اور اصفہان تک اسکی نسیم جان فزا پہونچی اور ان مقامات کے خزاں رسیدہ گلستانوں میں تازہ دم بہار آگئی، اس دوران میں حکومتوں کے تخت و تاج بدلتے رہے، مگر مدرسوں اور خانقاہوں کے خاک نشینوں کی بوریا . . . . کی بزم سجی رہی، ہمایوں کا بیشتر زمانہ حریفوں سے نبرد آزمائی میں گذرا حتیٰ کہ اسے ایک بار ہندوستان چھوڑ کر ایران جانا پڑا، مگر اس کے علمار و فضلاً اپنے دار الامان اور دار العلم میں پوری جمعیت خاطر کے ساتھ اپنے اعمال و وظائف میں مشغول رہے۔

ہمایونی دور میں دیار پورب میں کئی ایسے علما، و مشائخ آباد ہوئے جن کے خانوادوں میں صدیوں تک علم و فضل اور علمار و فضلار کی رونق رہی، چند مثالین ملاخطہ ہوں۔

میر علی عاشقاں سرائمیری متوفی ۹۵۰ھ (میر سید علی بن قوام الدین) اسی دور میں علاقہ سرہند کے مقام سوانہ سے آکر یہاں آباد ہو گئے، اور اپنے نام سے ایک بستی سرائمیر (اعظم گڈھ) بسائی، جس کا اصل نام مرتضیٰ پور ہے، یہیں فوت ہوئے، اور یہیں دفن کیے گئے، ان کے خاندان میں مشیخت کا سلسلہ آخری دور تک چلتا رہا۔

اسی زمانہ میں خانوادہ حامدیہ چشتیہ کے چشم و چراغ راجہ سید مبارک بن راجہ سید احمد مانک پوری متوفی ۲ر شوال ۹۶۵ھ نے مبارکپور (اعظم گڈھ) کو اپنے نام سے آباد کیا، اس خاندان کے مشائخ بھی مدتوں اس دیار میں رشد و ہدایت کی خدمت انجام دیتے رہے

میر علی عاشقان سرائمیری کے مرید و خلیفہ شیخ مبارک بن خیرالدین ظفر آبادی نے ماہل میں بود و باش اختیار کر کے اس کے قریب خیرالدین پور گاؤں آباد کیا۔

میر علی عاشقان سرائمیری کے دوسرے مرید و خلیفہ قاضی حبیب اللہ بن احمد عثمانی اصفہانی گھوسی (اعظم گڈھ) کے قاضی مقرر ہوئے، جہاں وہ مرة العمر رہے، . . . . ان کی اولاد میں کبھی کئی علماء پیدا ہوئے،

اسی دور میں چریا کوٹ (اعظم گڈھ) کا نام دینی و علمی تاریخ کے صفحہ پر نظر آتا ہے، شیخ عبد الحق دہلوی نے اخبار الاخیار میں شیخ یوسف چریا کوٹی کا ذکر کیا ہے، جو سلسلہ شطاریہ کے درویش تھے، گیارہویں صدی میں ان کی اولاد دوآبہ کے درمیان آباد تھی، اس کے بعد ہی سے چریاکوٹ حکمت و ادب کا گہوارہ بنا اور آخری دور تک یہاں سے مشاہیر پیدا ہوتے رہے۔

ہمایونی دور میں قاضی خان ظفر آبادی متوفی ۹۴۰ھ علوم ظاہری و باطنی کے جامع تھے، شیخ حسن بن طاہر جونپوریؒ کے مرید و خلیفہ تھے، ان کی قناعت پسندی اور بے نیازی کا یہ حال تھا کہ سلطان ہمایوں نے ہر چند التماس کی کہ کچھ نذرانہ اور عطیہ قبول کر لیں، مگر قاضی صاحب نے سلطانی پیش کش کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

از خدا خواہم و از غیر نخواہم   کہ نیم بندۂ غیر و نہ خدائے دگرست

اور جب ان کے بڑے صاحبزادے شیخ عبد اللہ کے نام معافی کا فرمان آیا، تو یہ کہہ کر انھوں نے بھی قبول نہیں کیا "بسر باید کہ بمتابعت پدر رود"[1] بیٹے کو چاہیے کہ باپ کی پیروی کرے، شہنشاہ ہمایوں کے تیئیس سالہ دور سلطنت میں ایسی متعدد مثالیں کتابوں میں ملتی ہیں کہ اس دیار کے علمار و فضلار و مشائخ پر نظر خسروانہ رہی اور اس نیک دل بادشاہ نے ان سے نیاز مندانہ تعلق رکھا،

سلطان محمد اکبر ۹۶۳ھ تا ۱۰۱۴ھ

ہمایوں کا بیٹا اکبر بھی اپنے بزرگوں کی طرح

---

[1] تذکرۃ العلمائے ہند ص ۱۶۶۔

علماء و مشائخ کا قدر داں اور علوم و فنون کا بڑا دلدادہ تھا، اس نے دینی انحراف و زیغ کے باوجود علم و فن کی خوب خدمت کی، پورب کے ارباب علم و فضل کے ساتھ بہتر سلوک کیا اور ان کی خدمت کو سعادت جانا، مولانا الٰہ داد بن کمال الدین حسینی لکھنوی متوفی ۹۹۱ھ زبردست عالم و مدرس اور مفتی و مصنف تھے، ۹۸۰ھ میں خان زمان خان کی سرکوبی کے لیے اکبر جونپور گیا، راستہ میں لکھنؤ آیا تو شیخ عبدالنبی گنگوہی کو بھیجا تاکہ وہ مولانا الٰہ داد سے مل کر ان کے علمی کمالات کا اندازہ لگائیں، اور بادشاہ کو اس کی خبر دیں، شیخ عبدالنبی نے واپس آکر اکبر سے ان کے علم و فضل کا تذکرہ کیا تو اس نے ملاقات کے لیے مولانا کو اپنے یہاں بلانا چاہا، مگر اقلیم علم کے بادشاہ نے صاف انکار کر دیا، بعد میں اکبر نے ان سے اس وقت ملاقات کی جب وہ نماز کے لیے مسجد میں تشریف لائے، اور افتاء کا عہدہ بہ اصرار پیش کیا جسے مولانا کو قبول کرنا پڑا[۱]

قاضی کمال الدین بن یعقوب مانک پوری متوفی ۹۹۶ھ فقہ، اصول فقہ اور قضاء کے مشہور عالم تھے، اکبر نے ان کو لشکر کا قاضی بنایا، پھر ترقی کر کے پورے ملک کے قاضی القضاۃ بن گئے، اور مدتوں اس عہدۂ جلیلہ پر رہ کر علحدہ ہوئے، تو بنگال کے قاضی مقرر کئے گئے، اسی زمانہ میں محمد معصوم کابلی نے بنگال میں اکبر کے خلاف شورش برپا کی اور قاضی کمال الدین نے اس کا ساتھ دیا، جس کی سزا میں اکبر نے انکو گوالیار کے قلعہ میں قید کرنے کا حکم دیا، مگر وہاں پہونچنے سے پہلے ان کا انتقال ہوگیا[۲]

راجہ سید مصطفےٰ مانک پوری متوفی ۹۸۹ھ راجہ سید مبارک مانک پوری کے صاحبزادے ہیں جنھوں نے ہمایونی دور میں مبارکپور آباد کیا تھا، راجہ سید مصطفےٰ

---

[۱] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۴۳ [۲] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۵۵

اکبری عہد کے درباری علماء و مشائخ میں سے تھے، ۹۸۴ھ میں اکبر کا لشکر آگرہ سے مالوہ کی طرف گیا، جس میں دیگر علماء فضلاء، مشائخ، شعراء اور درباریوں کی طرح راجہ سید مصطفےٰ بھی موجود تھے، گلزار ابرار کے مصنف محمد غوثی نے اسی موقع پر ان سے نیاز حاصل کیا تھا[۱] انھوں نے اپنے والد راجہ سید مبارک شاہ کا روضہ مانک پور میں اکبر کے زمانہ میں تعمیر کرایا تھا، تاریخی کتبہ میں اس کا خاص طور سے ذکر ہے، دو شعر یہ ہیں۔

در زمان جلال دیں اکبر — کہ بہ اوش خدا جہاں بانی
روضہ ساخت مصطفےٰ راجی — کش حور رضواں سزد بدربانی[۲]

شیخ جلال الدین ہانسویؒ کی اولاد میں شیخ ابراہیم دانشمند نبیرۂ شیخ اسمٰعیل کلاں محمد آباد گہنہ میں صاحب خوارق و کرامات بزرگ تھے، مرآۃ الاسرار میں ہے کہ اکبر نے تسخیر بنگالہ کی مہم پر جاتے ہوئے ان کی خدمت میں حاضری دی اور ان کی زبان سے نیک فالی کے الفاظ سنے[۳]

مولانا شمس نور (شمس الدین بن نور الدین) جونپوری متوفی ۱۰۰۱ھ اپنے زمانہ کے مشاہیر علماء و فضلاء میں سے تھے، دیوان محمد رشید جونپوری کے ماموں اور استاد تھے ملا محمود جونپوری نے بھی ان سے پڑھا تھا، اکبر نے مولانا شمس نور کو اپنے شاہزادے پرویز کی تعلیم پر مقرر کیا، اور انھوں نے الٰہ آباد جا کر یہ خدمت انجام دی، اس کے بعد اکبر نے مولانا کو جونپور میں عہدۂ قضا، دیا۔[۴]

قاضی الٰہ داد حنفی بلگرامی اور قاضی کمال عثمانی بلگرامی کے درمیان ۹۹۰ھ میں

---

[۱] گلزار ابرار قلمی ص ۱۱۴ (سالار جنگ میوزیم حیدرآباد) [۲] گنج ارشدی قلمی ص ۱۰ (خانقاہ رشیدیہ جونپور) [۳] مرآۃ الاسرار بحوالہ حدائق البیان ص ۲۳۲، [۴] تجلی نور

منصب قضا پر تنازع ہوا، اور معاملہ اکبر کے دربار تک پہونچا، اس نے قاضی اللہ داد کو بلگرام کا قاضی بنایا بعد میں جب معلوم ہوا کہ قاضی کمال یہاں کے خاندانی قاضی ہیں تو ان ہی کو یہ عہدہ دیدیا۔

شیخ محمد بن منّ اللہ سعدی کاکوروی متوفی ۱۰۰۳ھ تجوید و قرأت اور تصوف کے زبردست عالم تھے، فارسی میں شاطبیہ کی شرح لکھی تھی، اکبر ان کی بزرگی سے بہت متاثر تھا، اور گجرات سے فتحپور جاتے ہوئے کاکوری میں ان کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا کی درخواست کی، اور کچھ خیرات دی اور جاگیر بھی عطا کی، شیخ عبدالواحد بن ابراہیم بلگرامی متوفی ۱۰۱۷ھ فضائل و کمالات اور عبادات و ریاضات میں بے مثال عالم ہونے کے ساتھ کئی کتابوں کے مصنف تھے، اکبر نے بکمال تعظیم و تکریم کے ساتھ ان کو طلب کر کے جاگیر عطا کی،[1]

سلطان محمد جہانگیر (۱۰۱۴ھ تا ۱۰۳۶ھ) اکبر کا بیٹا جہانگیر تقریباً بائیس سال تک حکمراں رہا، وہ اپنے باپ اکبر کے برخلاف صحیح العقیدہ تھا، اور اکبری دور کے اثرات سے اس کا دماغ بہت جلد صاف ہوگیا، اس سلسلہ میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات نے بڑا کام کیا، جہانگیر نے حدیث کی تعلیم شیخ محمد سعید ہرویؒ سے حاصل کی تھی، جو میر کلاں کے لقب سے مشہور تھے، نیز مفتی صدر جہاں پہانوی اس کے اساتذہ میں سے ہیں۔

مغل بادشاہوں کی طرح جہانگیر بھی ارباب فضل و کمال کا بڑا قدردان تھا، اور دیار پورب کے علماء و فضلاء اور مشائخ سے عقیدت مندانہ تعلق رکھتا تھا۔

استاذ الملک ملا محمد افضل جونپوری متوفی ۱۰۶۲ھ اس دیار کے اساتذۂ عظام میں سے تھے، ملا محمود جونپوری اور دیوان محمد رشید جونپوری جیسے فضلائے دہر کے استاد تھے،

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۳۶

علم و فضل کا شہرہ دور دور تک تھا، یہ جہانگیر کا دور سلطنت تھا، جونپور کی وقائع نگار نے ملا محمد فضل کی علمی شہرت کے بارے میں جہانگیر کو اطلاع دی تو اس نے انکو استاذ الملک کا لقب دیکر جونپور کے شاہی مدرسہ کی مدرسی اور ساتھ ہی جاگیر کا پروانہ بھیجا مگر ملا صاحب نے اسکو قبول نہیں فرمایا، اور پوری زندگی تدریس میں توکل کے ساتھ بسر کی۔[1]

شیخ عبدالرزاق امیٹھوی کے بھانجے شیخ جعفر بن نظام الدین امیٹھوی متوفی ۱۰۴۵ھ نے تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے بعد اپنے ماموں سے خرقۂ خلافت پہنا، اور بستی کے باہر ایک دیہات میں سکونت اختیار کی، جب جہانگیر کو ان کے علم و فضل اور مقام و مرتبہ کا علم ہوا تو اس نے مفتی صدر جہاں کی سفارش پر ان کو دو سو بیگھہ زمین کی جاگیر عنایت کی، جس میں شیخ جعفر نے مسجد تعمیر کی، بعد میں اسی میں شیخ حسن سارنگ پوری نے ایک مدرسہ کی عظیم الشان عمارت بنائی جس میں طلبہ کے رہنے کے لئے کمرے بھی تھے۔

شیخ مصطفےٰ جونپوری اس دیار کے علمائے کبار میں سے تھے، ان سے چین قلیچ خان لاہوری نے تعلیم حاصل کی تھی، جب چین قلیچ خان جہانگیر کے خلاف بغاوت میں قتل کیا گیا تو شیخ مصطفےٰ بھی گرفتار ہوئے اور ۱۰۲۳ھ میں اجمیر میں جہانگیر کے سامنے پیش کئے گئے، اس نے شیخ محمد یوسف تتوی سندھی کو حکم دیا کہ شیخ مصطفےٰ سے معقولات کے دقیق مسائل میں مناظرہ کریں، چنانچہ دونوں بزرگوں میں ایک ہفتہ تک مباحثہ و مناظرہ کی مجلس گرم رہی، آخر میں شیخ محمد یوسف نے ان کے علم و فضل کا اعتراف کر کے جہانگیر سے ان کے بارے میں سفارش کی، جہانگیر نے شیخ مصطفےٰ کو نہ صرف معاف کر دیا بلکہ حرمین شریفین روانہ کیا، اور وہ حج و زیارت سے واپسی کے بعد جونپور میں آکر فوت ہوئے۔

مولانا علم اللہ بن شیخ عبدالرزاق امیٹھوی متوفی ۱۰۳۲ھ فقہ و حدیث اور عربیت کے

[1] تذکرۃ العلماء ص ۴۴ و ۴۵، نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۰۵ و ص ۲۰۶،

مشہور عالم تھے، شیخ ابن حجر مکیؒ سے حدیث پڑھی تھی، اور برہان پور میں سکونت پذیر تھے، عبدالرحیم بیرم خان ان سے بے حد عقیدت رکھتا تھا، زیادہ سے زیادہ ان کی صحبت میں رہتا تھا، ان کو عطایا و انعامات سے نوازتا تھا، اور دوسروں کے بارے میں ان کی سفارش سنتا تھا، حاکم برہان پور عادل شاہ بھی ان کے قدم برہانپور کو غنیمت جان کر ان کی انتہائی تعظیم کرتا تھا، ایک مرتبہ مولانا علم اللہ اور ان کے داماد قاضی نصیر الدین کے درمیان ایک دینی مسئلہ میں شدید ترین اختلاف ہوگیا اور نوبت محضر نامہ تک پہونچ گئی، عبدالرحیم بیرم خان نے اس قضیہ کو جہانگیر کے سامنے پیش کیا، اس نے خسر اور داماد کو لشکر میں طلب کیا اور معاملہ اس نتیجہ پر جاکر رفع دفع ہوا کہ قاضی نصیر الدین حجاز روانہ ہوئے، اور مولانا علم اللہ بیجاپور میں ابراہیم عادل شاہ کے یہاں چلے گئے، قاضی نصیر الدین حدیث کی ترجیح میں قیاس کے منکر تھے، اور حدیث علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل کو موضوع بتاتے تھے اسی پر یہ ہنگامہ برپا ہوا تھا۔

سلطان محمد شاہجہان ۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۸ھ	جہانگیر کے بعد اس کے بیٹے شاہجہان نے تقریباً ۳۲ بتیس سال حکومت کی اس کا طویل دور سلطنت علم و علماء کے حق میں بڑا اچھا تھا

اس نے اپنے خاندان کی کئی بدعات اور مظالم ختم کر کے عدل و انصاف اور امن و امان کے ساتھ حکومت کی، مساجد و مشاہد تعمیر کئے، دور دراز سے علماء و فضلاء اور مشائخ اس کے دربار میں آئے، اور عزت و احترام کے مستحق ٹھہرے، اس کا زمانہ ہر اعتبار سے بہتر تھا، بلاد پورب میں علم و فن کی نشاۃ نو ہوئی، اور جونپور دار العلم، دار الامان اور دہلی ثانی کے القاب کے بعد شیراز ہند کے لقب سے یاد کیا گیا، آزاد بلگرامی نے لکھا ہے شاہجہان نے علاقہ پورب کو شیراز ہند کہکر افتخار کیا صاحب قران ثانی شاہجہان انار اللہ برہانہ

می گفت پورب شیراز ماست"[1] مولانا خیر الدین محمد نے اس بارے میں تاریخ شاہجہانی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ

حضرت صاحبقران شاہجہان بادشاہ شہر جونپور را شیراز ہندمی فرمود، و بدار العلم موسوم می نمود[2]	صاحبقران شاہجہان بادشاہ نے جونپور کو شیراز ہند کہکر دار العلم کے نام سے موسوم کیا۔

شاہجہان نہایت دیندار اور شریعت کا پابند تھا، پورے ہندوستان میں امر و نواہی کے اجراء میں کوشش کرتا تھا، تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد امراء و حکام کو اس بارے میں تاکیدی احکام دیتا تھا، جس کے نتیجہ میں بقول محمد صالح کنبوہ، "متکفلان مہمات شرعی و متصدیان خدمات عرفی شرائط تفحص و تجسس بجا آرند" یعنی شرعی اور کے ذمہ دار اور عام حکام اسی شدت کے مطابق عمل کرتے تھے، عمل صالح میں ان کی تفصیلات موجود ہیں، اور ایک جگہ تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ

و شبستان ہند را از سر نو بہ پرتو چراغ شریعت محمدی نور آگیں ساختہ[3]	شاہجہان نے شبستان ہند کو شریعت محمدی کے چراغ کی روشنی سے از سر نو منور کیا،

ان شرعی و دینی مہمات کے لیے علماء و فضلاء کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں اور یہی قاضی و محتسب وغیرہ بنائے جاتے تھے،

ہمایونی دور کے شروع میں بنگال، بہار اور بلاد پورب میں بہت انتشار پایا جاتا تھا، شاہجہان نے اس کا خاتمہ کیا، ۱۰۴۱ھ میں پرتگیزیوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کو ختم کرنے کے لئے حاکم بنگالہ خواجہ قاسم صفدر خان اور دیگر امراء و حکام کو حکم دیا، ہوگلی میں

---

[1] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۲۱ [2] تذکرۃ العلماء ص ۴ و ص ۵ [3] عمل صالح ج ۱ ص ۱۹۰ مطبوعہ لاہور

فرنگیوں نے طاقت جمع کر لی تھی، اور آس پاس کے راجوں اور زمینداروں کے قریات کو پٹہ اور رہن پر لیکر باشندوں کو عیسائی بنانا شروع کر دیا تھا، شاہجہان نے ان کے خلاف سخت اقدام کرا کر شاندار فتح پائی، ۱۰۳۳ھ میں عبد الرحیم خانخانان کے بیٹے لشکر شکن کو لکھنؤ کا فوجدار بنایا، جلوس کے دسویں سال ۱۰۴۶ھ میں بھوجپور (بہار) کے اطراف کے سرکش راجوں اور زمینداروں کی سرکوبی کے لیے شاہجہاں کے حکم سے عبد اللہ خان بہادر فیروز جنگ، باقر خان نجم ثانی الہ آباد، اور فدائی خان زمیندار گورکھپور نے ان سب پر فوج کشی کی اور کئی ماہ کی شدید جنگ کے بعد فتح پائی ۱۰۵۰ھ میں اعتقاد خاں، زبردست خاں، صوفی بہادر، اور عبد اللہ نجم ثانی نے پلاموں (بہار) کے راجہ پرتاب کو زیر کیا، ان واقعات کی تفصیل کے لیے محمد صالح کنبوہ کی کتاب عمل صالح ملاحظہ ہو۔

۱۰۴۶ھ میں بھی بھوجپور کی جنگ و فتح کے سلسلہ میں صوفی بہادر کا نام ملتا ہے، عمل صالح میں ہے۔ "زبردست خان و صوفی بہادر حسب الامر سردار بفتح قلعہ کالاپور شتافتہ، بعد از محاصرۂ یک ماہ آں را بہ کشش و کوشش تمام مسخر گردانیدند" (ج ۲ ص ۱۹۲) غالباً اسی فوجی افسر صوفی بہادر کے نام پر سکٹی پورہ صوفی بہادر کی بستی ہے، جو اب مبارکپور کا مغربی محلہ ہے، اور پورہ صوفی کے نام سے مشہور ہے، راقم کے پاس "اللہ خدائی" نامی کتاب کا قلمی نسخہ ہے، جس کے آخر میں ہے "تمام شد کار م نظام . . . . . نسخہ اللہ خدائی بیاض خاطر میاں عبد الرحیم بن دالی ساکن سکٹی پورہ صوفی بہادر" نیز اس کتاب پر ایک تملیکی تحریر یوں ہے، جان محمد پسر عبد الواحد ساکن پورہ صوفی بہادر، ۱۲۴۴ھ فصلی" دونوں تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ محلہ اسی صوفی بہادر کے نام پر ہے، الا یہ کہ دوسرا مشہور آدمی اسی نام

نام کا، باعث ہو۔

قصبہ مئو شاہجہانی دور میں خصوصی توجہ کا مستحق ٹھہرا، علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے "کہتے ہیں کہ یہ قصبہ شہزادی جہاں آرا بنت شاہجہان کی جاگیر میں تھا، اسی لئے اس کا نام جہاں آباد رکھا گیا، شہزادی نے اپنے شوق سے یہاں کپڑے بننے والے کاریگروں کو جمع کیا، اور جامع مسجد بنوائی جس کے چاروں طرف طلبہ کے لیے حجرے تھے،"[1]

شاہجہاں اور اس کے وزراء، امراء اور حکام میں آصف خان، سعد اللہ خاں، شائستہ خاں، شہزادہ محمد شجاع وغیرہ شرقی علماء و فضلاء کو حضرات میں سے تصور کرتے تھے، اور اس دیار کے کئی علماء سلطانی دربار سے منسلک ہو کر مراحم خسروانہ و ملوکانہ سے حصہ پا رہے تھے، معلوم ہو چکا ہے کہ سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے شیخ محمد بن خضر کے صاحبزادے شیخ منیر کو پرگنہ محمد آباد میں کئی قریات جاگیر میں دیئے تھے، اور بعد میں ان کا خاندان یہیں آباد ہو گیا، اسی میں ایک بزرگ مولانا حاجی ابوالخیر بن شیخ ابوسعید بھیردی متوفی ۱۰۵۹ھ ملا محمود جونپوری کے بہنوئی اور معاصر تھے، وہ شاہجہانی دور میں پورب کے علمائے ل میں شمار ہوتے تھے، اور شاہی دربار سے ان کے تعلقات نہایت گہرے تھے، اوائل ہی میں ان کی علمی شہرت دہلی تک پہونچ گئی تھی، انھوں نے دہلی کا قصد کیا تو امیر الامراء نواب شائستہ خاں نے ان کی آمد کو غنیمت جان کر بڑی عقیدت مندی اور گرم جوشی سے استقبال کیا اور ان سے حدیث، تفسیر اور تصوف کی تعلیم حاصل کی، شائستہ خاں کی اس والہانہ عقیدت اور استفادہ کی وجہ سے شاہجہان بھی مولانا ابو الخیر کی زیارت کا مشتاق ہوا، اور مل کر بڑی خوشی کا اظہار کیا، اور شائستہ خان کے مشورہ سے ہر چند چاہا کہ مولانا کوئی شاہی منصب

---

[1] مقدمہ حیات شبلی ص ۵۰،

یا جاگیر قبول کر لیں، مگر انھوں نے انکار کر دیا، نواب شائستہ خان کی والدہ نہایت نیک اور پارسا تھیں ایک مرتبہ انھوں نے کمال عقیدت سے کچھ رقم سے مولانا کی خدمت کرنی چاہی مگر اس سے بھی انکار کر دیا، مولانا نے ۱۰۵۶ھ میں حج و زیارت کی دولت پائی اس موقع پر نواب شائستہ خان نے عرض کیا کہ خادم کا جہاز حجاز آتا جاتا ہے، حکم دیں تو اسکے عملہ کو حکم کر دوں کہ آپ کو راحت و آرام کے ساتھ لیجائیں، اس پر مولانا نے کہا

"وائے بر ہمت دے کہ در راہ دوست وسیلۂ غیر درمیان آرد۔"

ایک مرتبہ مولانا ابوالخیر شاہجہاں کے ساتھ سیالکوٹ میر صاحب کی خدمت میں گئے، شاہجہاں …… ٭٭ نے ان کی خدمت میں نذر پیش کی، میر صاحب نے مولانا ابوالخیر کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ اس ہدیہ کے زیادہ مستحق ہیں، انھوں نے محنت و مشقت سے علم حاصل کیا ہے۔" یہ جملہ مولانا ابوالخیر کے دل پر تیر و نشتر کا کام کر گیا، اور دینی غیرت و علمی حمیت سے مغلوب ہو کر دلیدپور بھیرا میں آکر گوشہ نشیں ہو گئے [1]

مولانا ابوالخیر بھیروی کی تین شادیوں میں سے ایک شادی شیخ محمود قریشی بانسی مبارکپوری کی دختر سے ہوئی تھی، مگر اس سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، شیخ صاحب بڑے رعب وداب کے رئیس اور بائیس (۲۲) گاؤں کے زمیندار تھے۔ اور ریاست و زمینداری کی رقابت میں قتل کئے گئے۔

جہانگیر نے ملا محمد افضل جونپوری کو استاذ الملک کے خطاب سے نوازا تھا، اور انکے دو (۲) شاگردوں کو شاہجہاں نے عقیدت و احترام کی مسند پر بٹھایا، یہ دونوں شاگرد علم و فضل اور حکمت میں اتنے اونچے تھے کہ استاذ الملک فرمایا کرتے تھے کہ علامہ جرجانی

---

[1] مناقب غوثی باب ہشتم قلمی (دارالمصنفین)

اور علامہ تفتازانی کے بعد ایک عہد اور ایک شہر میں ان دونوں فضلاء کے جیسے اب تک دو فاضل جمع نہیں ہو سکے تھے، ایک دیوان محمد رشید جونپوری متوفی ۱۰۸۳ھ اور دوسرے ملا محمود جونپوری متوفی ۱۰۶۲ھ ان دونوں فضلائے عصر کو شاہجہاں نے مراحم خسروانہ کے ذریعہ قدردانی کرنی چاہی، مگر دیوان محمد رشید نے امراء و سلاطین کی طرف سے بے رغبتی و بے اعتنائی کے باعث یہ پیش کش قبول نہیں فرمائی، شاہجہاں نے ان کے اوصاف و کمالات اور علمی و دینی شہرت سنکر زیارت کی خواہش کی، اور ایک خاص وکیل کے ذریعہ فرمان بھیجکر ان سے دہلی آنے کی گذارش کی مگر دیوان صاحب نے حاضری سے معذوری ظاہر کر دی، [1] البتہ ملا محمود نے شاہی دربار سے منسلک ہو کر شاہجہاں کی تمنا پوری کی، ملا محمود جونپوری متوفی ۱۰۶۲ھ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ہندوستان میں اسلام کی آمد کے بعد سے حکمت و فلسفہ میں ان کی ٹکر کا کوئی عالم پیدا نہیں ہوا، ملا صاحب فراغت کے بعد تدریس و تعلیم اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے، چند دنوں میں ان کے علم و کمال کا شہرہ جونپور کے مدرسہ کی چہار دیواری سے نکل کر دار الخلافہ کے شاہی دیوان میں گونجا اور شاہجہاں نے کمال عقیدت مندی سے دہلی بلا کر فضلائے شاہی میں شامل کر لیا، اور منصب سہ صدی ذات سے نوازا، اس سفر میں جب ملا صاحب دہلی کے قریب پہونچے تو بادشاہ کے حکم سے وزیر سعد اللہ خان نے جو خود زبردست عالم بھی تھے استقبال اور پیشوائی کی خدمت انجام دی، اور جب ملا صاحب دربار میں پہونچے تو بادشاہ کے پہلو میں بٹھائے گئے، اس اعزاز و اکرام کے بعد ان کو جونپور روانہ کر دیا گیا، جہاں شاہی مدرسہ میں درس دیتے رہے، اور وقتاً فوقتاً دہلی جایا کرتے تھے۔

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۱۹۔

شاہجہاں بسا اوقات ان سے علمی مسائل میں استفادہ کرتا تھا، شاہزادہ محمد شجاع کی تعلیم کے لیے ان کو بنگال بھیجا، وزیر سعد اللہ خان، نواب شائستہ خان اور آصف خان ملا صاحب کے خوشہ چینوں میں تھے، ایک مرتبہ بادشاہ نے دربار میں ایک ایرانی فاضل، کیج اور ملا صاحب میں مناظرہ کرایا جس میں ملا صاحب کو کھلی کامیابی حاصل ہوئی، اور بادشاہ نے ان کو خوب نوازا، ایک مرتبہ شاہجہاں اور ملا صاحب لاہور گئے، میر عبد الحکیم سیالکوٹی بھی ساتھ تھے، اسی سفر میں حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں تینوں حضرات حاضر ہوئے اور میر صاحب کی ایک توجہ سے فضلاء شاہی دربار سے یکسو ہو گئے، ملا صاحب نے علم بلاغت میں الفرائد لکھکر شاہجہاں کے نام سے معنون کی، اور نہایت علمی و ادبی انداز میں اس کا تذکرہ کیا۔[1]

ملا رکن الدین ہریابادی غازی پوری ملا محمود جونپوری کے ہم سبق استاد بھائی تھے، وہ بھی شاہجہانی امراء کے منظور نظر تھے، امیر الامراء نواب شائستہ خان کا بڑا قدردان تھا، اور وہ اسی سے منسلک تھے، ایک مرتبہ ملا رکن الدین دہلی سے غازی پور آئے اور نہایت اعلیٰ قسم کی کشمیری شال جو شائستہ خان نے ان کو دی تھی، اپنے استاد زادے ملا محمد صادق بن ملا شمس نور متوفی سنہ ۱۰۶۴ھ کی خدمت میں پیش کی، مگر ملا صادق نے یہ کہکر اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا، من دلق را با طلس شاہان نمی خرم" فقیر گلیم بس است لائق شال خود را نمی انگارم"[2]

مفتی عبد السلام دیوی متوفی سنہ ۱۰۴۷ھ دیوہ ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے، مفتی عبد السلام

---

[1] ان واقعات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ ملا محمود جونپوری" معارف مئی جون جولائی سنہ ۱۹۶۳ء [2] تجلی نور ج ۲ ص ۸۵،

لاہوری سے تعلیم حاصل کر کے فقہ، اصول فقہ اور علم کلام میں یکتا ہوئے، اور لاہور ہی میں تدریس و تعلیم کا سلسلہ جاری کیا، بعد میں شاہجہاں نے ان کو لشکر کا قاضی بنایا، اس منصب پر ایک زمانہ تک رہ کر خدمت انجام دی، پھر علحدگی اختیار کر کے لاہور چلے گئے۔

قاضی محمد حسین جونپوری متوفی سنہ ۱۰۷۰ھ اپنے زمانہ کے مشہور ارباب علم و کمال میں سے تھے، شاہجہاں کی نگاہ جوہر شناس نے ان کو جونپور کا قاضی مقرر کیا تھا۔

مفتی مبارک بن مفتی ابو البقاء جونپوری متوفی سنہ ۱۰۹۰ھ شاہجہانی دور کے مشاہیر علماء میں سے تھے، جونپور اور الٰہ آباد میں تحصیل علم کرنے کے بعد دہلی گئے، اور وہاں سے مفتی جونپور کا پروانہ لیکر لوٹے،

ملا محب اللہ الٰہ آبادی متوفی سنہ ۱۰۵۸ھ مشائخ چشتیہ میں بڑے مقام و مرتبہ کے بزرگ تھے، لاہور جاکر مفتی عبد السلام لاہوری سے پڑھا، شیخ محمد میر اور سعد اللہ خان ان کے ہم سبق تھے، جب شاہجہاں نے سعد اللہ خان کو وزارت دی تو انھوں نے اپنے دونوں ساتھیوں کو یاد کیا، اور ان کو شاہی منصب پر رکھنا چاہا، شیخ محمد میر نے زہد و تقویٰ کی وجہ سے دربار سے تعلق کو پسند نہیں کیا، اور مولانا محب اللہ کو سعد اللہ خان نے الٰہ آباد کی نظامت کا عہدہ دیکر رخصت کیا، مگر ملازمت ان کے ذوق کے خلاف تھی، اس لئے کچھ دنوں کے بعد اسے چھوڑ کر شیخ ابو سعید گنگوہیؒ کی خدمت میں چلے گئے، اور ایک مدت تک ان کی خدمت میں رہ کر شیخت کے مرتبہ کو پہونچے[1]

مفتی محمد صادق بن شیخ شمس نور جونپوری، متوفی سنہ ۱۰۶۶ھ شاہجہانی دور کے مشہور عالم و بزرگ تھے، ملا محمود جونپوری کے تلامذہ میں زہد و تقویٰ کے اعتبار سے بلند مقام کے مالک تھے،

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۲۳،

اورحکام وقت ان کا بے حد اقرار کرتے تھے، ایک مرتبہ حاکم جونپور نواب اللہ وردی نے اپنے ایک غیر شرعی تحریر پر مفتی صاحب سے اپنی مہر ثبت کرنے کی گذارش کی، آپ نے صاف انکار کر دیا، نواب اللہ وردی خان سیر دریا کے بہانے سے ان کو کشتی میں سوار کرکے بیچ دریا میں لے گیا، اور ان سے کہا کہ کاغذ پر مہر لگانے کا اقرار کیجئے، ورنہ میں آپ کو دریا میں پھینک دوں گا، آپ نے فرمایا جبر و اکراہ کی حالت میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، اس کے بعد انگوٹھی نکال کر نواب کو دیدی، مگر نواب پر تقوی کا کچھ ایسا رعب چھایا کہ وہ مہر نہ لگا سکا، اور معذرت خواہ ہوا،[ل]

(باقی)

ضروری اطلاع

دو باتوں کا خاص طور سے خیال رکھئے۔

۱۔ خط و کتابت میں اپنا خریداری نمبر ضرور لکھ دیا کیجئے۔ اس سے ہمیں بڑی آسانی ہو جائے گی۔

۲۔ معارف ہر ماہ کی پندرہ تاریخ کو روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر کسی صاحب کو ۲۵ تاریخ تک نہ ملے تو ہمیں اطلاع دے دیں۔ بہت دیر میں اطلاع ملتی ہے تو رسالے ختم ہو چکے ہوتے ہیں، اور تعمیل نہیں ہو پاتی ہے۔

معارف کے پرانے پرچے

معارف کے پرانے پرچے بھی مل سکتے ہیں، لیکن وہ مسلسل نہیں ہیں، ۱۹۱۶ء سے ۱۹۶۵ء تک متفرق پرچے مل سکیں گے۔ اور کچھ مکمل فائلیں بھی ہیں جن حضرات کو ضرورت ہو وہ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔

"منیجر"

مولانا شمس الحق عظیم آبادی

از مولوی محمد عزیر صاحب بہاری مرکزی دار العلوم بنارس

تیرہویں اور چودھویں صدی ہجری کے جن ہندوستانی علما نے اپنی زندگی خدمت حدیث کے لیے وقف کر دی تھی، ان میں مولانا شمس الحق عظیم آبادی نہایت ممتاز ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک ان کے بارہ میں بہت کم لکھا گیا ہے، تلاش و تفحص کے بعد جو معلومات فراہم ہو سکی ہیں ان کو اس مضمون میں پیش کیا جاتا ہے،

نام و نسب | ابو الطیب محمد شمس الحق بن امیر علی بن شیخ مقصود علی بن شیخ غلام حیدر بن[۱] شیخ ہدایت اللہ بن شیخ محمد زاہد بن شیخ نور محمد بن شیخ علاء الدین ۔۔۔۔

مکمل شجرہ مولانا کے صاحبزادے حکیم محمد ادریس ڈیانوی کے پاس موجود تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ (م ۱۳ھ) سے نسبی تعلق تھا[۲] والدہ کی جانب سے بھی ان کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ پر منتہی ہوتا ہے۔[۳] اس طرح وہ

---

[۱] علامہ عظیم آبادی عموماً اپنی کتابوں میں والد، دادا، اور پردادا کے نام اس طرح لکھتے ہیں، امیر بن علی بن حیدر (غایۃ المقصود ج ۱ ص ۲۔ التعلیق المغنی ج ۱ ص ۲ و اعلام اہل العصر باحکام رکعتی الفجر ص ۲)، غالباً شیعیت کے اشتباہ کی وجہ سے ان ناموں کو مرکب کے بجائے مفرد لکھنا پسند کرتے رہے ہونگے

[۲] یادگار گوہری ص ۱۰۱ و ہفتہ وار اہلحدیث امرتسر ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۹ء ص ۸ [۳] یادگار گوہری ص ۶۰

ننہیال اور ددھیال دونوں طرف سے صدیقی ہیں۔ مسکن و مولد کی نسبت سے عظیم آبادی[1] اور ڈیانوی کہلاتے ہیں[2]۔ "محدث ڈیانوی"، "علامہ عظیم آبادی"، صاحب عون المعبود اور مولف غایۃ المقصود سے بھی ان کی شہرت ہے۔

خاندان و ماحول ان کے آباو اجداد کا اصل مکان موضع ہر اس گپہ تھا جو فتوحہ اسٹیشن (ضلع پٹنہ) سے دو میل کے فاصلہ پر واقع ہے ان کے پردادا مولوی شیخ غلام حیدر ذی اثر اور صاحب مقدرت شخص تھے، گذری (محلہ عظیم آباد پٹنہ) میں ان کی کئی عالیشان کوٹھیاں تھیں، ان کے والد مولوی شیخ امیر علی کا قیام کبھی ہر اس گپہ اور کبھی گذری میں رہتا، ۱۲۶۳ھ میں جب انکا نکاح رمنہ (محلہ عظیم آباد (پٹنہ) اور ڈیانواں کے رئیس مولانا گوہر علی (م ۱۲۷۶ھ) کی صاحبزادی سے ہوا تو وہ اکثر رمنہ میں اپنے خسر صاحب ہی کے مکان پر قیام کرنے لگے، کیونکہ مولانا گوہر علی اور ان کی بیوی اپنی اکلوتی لڑکی کو غرط محبت کی وجہ سے اپنے سے جدا کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔

---

[1] موجودہ شہر پٹنہ پہلے عظیم آباد کہلاتا تھا، اٹھارہویں صدی میں جب شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر (م ۱۷۰۷ء) نے اپنے پوتے شہزادہ عظیم الشان (بن شاہ عالم (م ۱۷۱۲ء) کو بہار کا صوبہ دار مقرر کیا تو اسی کے نام پر پٹنہ کا نام عظیم آباد رکھا، یہ قدیم تاریخی شہر ہے، مفصل معلومات کے لئے دیکھئے۔ نیا دور (لکھنؤ) (مئی ۱۹۷۰ء ص ۱۰۰)، محمد محفوظ الحسن کا مقالہ: "عظیم آباد - آئینۂ ایام میں"

[2] پٹنہ شہر سے جنوب مشرق کی جانب ۴۲ میل کے فاصلہ پر اور فتوحہ اسٹیشن سے ۸ میل کی دوری پر ڈاکخانہ گھرائے پر سرائے سے متصل ڈیانواں، ایک چھوٹی سی بستی ہے، علامہ عظیم آبادی کا ننہیال یہیں تھا، ان کی پرورش و پرداخت اور نشو و نما بھی یہیں ہوئی، اور وہ اخیر عمر تک اسی بستی میں مقیم رہے ہے۔

مولانا کے والد ماجد شیخ امیر علی بڑے نیک اور منکسر المزاج شخص تھے، انھوں نے فارسی کے اسباق اپنے بزرگوں سے پڑھے، اور مولوی عبد الحکیم، مولوی مسیح اللہ اور مولوی ابو الحسن (م ۱۲۹۳ھ) وغیرہ سے رمنہ میں شرح وقایہ، شرح جامی اور دیگر کتابیں پڑھیں، اس کی وجہ سے شرعی مسائل میں ان کو اچھی سوجھ بوجھ ہوگئی تھی، ان کی ولادت ۱۲۴۳ھ میں اور وفات رمنہ میں ۱۲۸۴ھ میں ہوئی، اور ہر اس گپہ میں مدفون ہوئے۔

مولانا کی والدہ ماجدہ ماہ صفر ۱۲۴۹ھ میں بمقام رمنہ پیدا ہوئیں، جب سن شعور کو پہنچیں تو منشی بشارت کریم نے ان کو نماز روزہ کے ضروری مسائل کی تعلیم دی اور پارۂ عم اور مختلف سورتیں اور ادعیۂ ماثورہ پڑھائیں، ربیع الاول ۱۲۶۳ھ میں انکا نکاح مولوی شیخ امیر علی سے ہوا۔ یہ بڑی نیک بخت خاتون تھیں، ابتدا ہی سے صوم و صلوٰۃ اور اوراد و وظائف کی پابند تھیں، نفل نمازوں اور نفلی روزے۔ التزام سے رکھتی تھیں، اعتکاف و قیام رمضان کی بھی پابند تھیں، روزآنہ تین پارے قرآن تلاوت کرتیں اور دعائیں بھی پڑھتی تھیں، رمضان میں روزآنہ دس پارے قرآن پڑھنے کا معمول تھا، وہ اتباع سنت کا بڑا خیال رکھتی تھیں اور ان پر ہمیشہ خشیت الٰہی غالب رہتی تھی، توحید کی صحیح حقیقت اور دین کی اصل روح سمجھ لینے کے بعد وہ ان غلط عقیدوں اور شرعی ممنوعات سے بالکل تائب ہوگئیں، جن کو نادانستہ طور پر اختیار کئے ہوئے تھیں، ۱۳۱۲ھ میں اپنے پوتوں اور خاندان کے بعض اعزہ کے ساتھ مکہ مکرمہ کی زیارت کی اور حج بیت اللہ سے مشرف ہوئیں[1] حج سے واپسی کے بعد کچھ دنوں زندہ رہیں، تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا، اللہ تعالٰی نے انھیں پانچ لڑکیاں اور چار لڑکے عطا

---

[1] مکتوب حکیم محمد ادریس ڈیانوی بنام مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی (مورخہ ۲۴ محرم ۱۳۳۳ھ) یہ خط اتفاق سے راقم کو مل گیا اور اب میرے پاس محفوظ ہے۔

بڑے لڑکے کبیر الحق اور چھوٹے ظہیر الحق کم سنی ہی میں رحلت کر گئے، تیسرے لڑکے مولانا شمس الحق (م ۱۳۲۹ھ) اور چوتھے مولانا محمد اشرف (۱۳۲۶ھ) تھے،

علامہ عظیم آبادی کے نانا مولانا گوہر علی کی ولادت ڈیانواں میں ۱۲۱۳ھ میں ہوئی، تحصیل علم کے لیے بیتھو (ضلع گیا) اور دوسرے مقامات کا سفر کیا، جب فارسی میں اچھی دستگاہ ہو گئی تو عربی کی درسی کتابیں محنت و توجہ سے پڑھیں، مولانا گوہر علی کے والد شیخ مہر علی (م ۱۲۵۲ھ) زیادہ فارغ البال نہ تھے، اس لیے پڑھنے کے بعد انھوں نے ایک معمولی ملازمت کر لی مگر ترقی کر کے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے، اس کی وجہ سے ان کی آمدنی اور جائداد میں بہت اضافہ ہو گیا تھا، ۱۲۴۲ھ میں شیخ روشن علی نگرنہسوی (م ۱۲۵۰ھ) کی صاحبزادی سے نکاح ہوا جس سے ایک لڑکی اور آٹھ لڑکے پیدا ہوئے، مولانا گوہر علی علما کے بڑے قدرداں اور نہایت فیاض طبع شخص تھے، وہ محتاج اور ضرورتمند لوگوں کی برابر مدد کرتے رہتے تھے، بعض علما نے مستقل طور پر ان کے یہاں بود باش اختیار کر رکھی تھی اور وہ ان کی خوب خاطر مدارات کرتے تھے، ان کی سخاوت و فیاضی اور علمی قدر دانی کے بعض واقعات مشہور ہیں، ان کو کتابیں جمع کرنے کا بھی بہت شوق تھا، ان کے کتب خانہ میں قلمی کتابوں کا زیادہ ذخیرہ تھا، آخر عمر میں بواسیر کی شکایت ہو گئی تھی، ۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۶ھ کو رحلت فرمائی اور ڈیانواں میں مدفون ہوئے۔[1]

مولانا عظیم آبادی کے خاندانی حالات اور ماحول کا تفصیل سے اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ اس خاندانی نجابت و شرافت اور ماحول کی روایات و خصوصیات کا ان کی طبیعت اور مزاج اور سیرت و شخصیت پر اثر پڑنا ناگزیر تھا،

[1] خاندان سے متعلق اکثر معلومات اور سنین وفات وغیرہ یادگار گوہری سے ماخوذ ہیں۔

ولادت و طفولیت: وہ ۲۷ ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ جولائی ۱۸۵۷ء کو رمنہ میں پیدا ہوئے پانچ سال کی عمر میں اپنی والدہ کے ساتھ اپنے ننہال ڈیانواں چلے آئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی کیونکہ ان کی والدہ بھی مستقل طور پر یہیں رہتی تھیں، ابھی گیارہ سال ہی کی عمر تھی کہ ۱۲۸۴ھ میں والد انتقال کر گئے، ان کی ماں، نانی اور بڑے ماموں نے لاڈ پیار سے پالا پوسا۔ ان کے بڑے ماموں مولوی محمد احسن (م ۱۳۱۰ھ) ان سے بڑی محبت کرتے تھے، اور کبھی ان کی کوئی خواہش رد نہیں کرتے تھے، تعلیم و تربیت اور تمام ضرورتوں کی اس طرح کفالت کی کہ مولانا کو کبھی باپ کے سایۂ شفقت سے محرومی کا احساس نہ ہونے دیا۔[1]

تعلیم و تربیت: مولانا محمد ابراہیم نگرنہسوی (م ۱۲۸۲ھ) نے بسم اللہ کرائی، اور سورۂ "اقرأ" پڑھایا۔ پھر ڈیانواں ہی میں حافظ اصغر علی رامپوری اور دوسرے معلمین سے ابتدائی تعلیم حاصل کرتے رہے، فارسی کی کتابیں پڑھنے کے بعد مولانا لطف العلی بہاری (م ۱۲۹۶ھ) سے عربی شروع کی اور شرح جامی، قطبی، میبذی، اصول الشاشی، نور الانوار، شرح وقایہ، کنز الدقائق اور جامع ترمذی وغیرہ بھی ان ہی سے پڑھیں، اس عرصہ میں اپنے ماموں مولوی نور احمد ڈیانوی سے بھی استفادہ کرتے رہے۔

تحصیل علم کے لیے سفر: ۱۲۹۲ھ میں حصول علم کے لیے پہلی بار ڈیانواں سے باہر قدم نکالا اور لکھنؤ تشریف لے گئے، یہاں مولانا فضل اللہ لکھنوی (م ۱۳۱۱ھ) سے سال بھر تک معقولات کا درس لیتے رہے، ۲۶ محرم ۱۲۹۳ھ کو مراد آباد[2]، مولانا بشیر الدین قنوجی (م ۱۲۹۶ھ)

[1] یادگار گوہری ص ۱۰۱۔ [2] بعض لوگوں نے بھوپال جا کر مولانا بشیر الدین قنوجی اور شیخ حسین بن انصاری سے استفادہ کرنے کا ذکر کیا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ درحقیقت وہ بھوپال کے بجائے مراد آباد تشریف لے گئے تھے، (ملاحظہ ہو یادگار گوہری ص ۱۰۰، وغیرہ)

کی خدمت میں کتب درسیہ کی تکمیل کے لیے حاضر ہوئے. ایک سال سے کچھ زیادہ قیام کرنے کے بعد وطن واپس آئے، اور پھر دوبارہ ۲۰ جمادی الاولی ۱۲۹۴ھ کو مولانا موصوف کی خدمت میں مراد آباد پہنچے اور معقولات، بلاغت اور معانی کی کتابیں، اور قرآن مجید کا ترجمہ اور مشکوٰۃ المصابیح کا کچھ حصہ پڑھا اور قرآن و حدیث اور فقہ و عقائد سے متعلق مسائل کی تحقیق بھی، کرتے رہے۔

اوائل محرم ۱۲۹۵ھ میں دہلی مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی (م ۱۳۲۰ھ) کی خدمت میں استفادہ کے لیے تشریف لے گیے، اخیر محرم ۱۲۹۶ھ میں میاں صاحب موصوف سے حدیث و تفسیر کی سند حاصل کرکے اپنے مکان واپس آ گئے، اور درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے، چھ سال بعد ۱۳۰۲ھ میں میاں صاحب کی کشش اور محبت دوبارہ ان کو دہلی کھینچ لے گئی، چنانچہ ان سے دوسری سند لیکر ۱۳۰۳ھ میں ڈیانواں تشریف لائے، دونوں مرتبہ دہلی میں میاں صاحب کے پاس قیام کی مدت تقریباً تین سال رہی، اس عرصہ میں ان سے ترجمہ قرآن مجید، تفسیر جلالین، صحاح ستہ موطا امام مالک، سنن دارمی، سنن دار قطنی اور شرح نخبۃ الفکر (نزہۃ النظر) سبقاً سبقاً پڑھی، اور فتاوی بھی قلمبند کرتے رہے،

دہلی کے دوسرے سفر میں شیخ حسین بن محسن انصاری (م ۱۳۲۷ھ) کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے، اور صحاح ستہ کے اطراف پڑھکر ان سے عام اجازت حاصل کی، اسکے علاوہ بھی مختلف وقتوں میں وہ دس بارہ دفعہ علامہ موصوف کی خدمت میں حاضر ہو کر مستفید ہوئے۔[1]

مولانا عظیم آبادی کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ ان کو اپنے زمانہ کے ان دو جلیل القدر

[1] یادگار گوہری ص ۱۰۹

محدثین سے استفادہ کا موقع ملا۔ یہ اسی کا فیض ہے، کہ انکی پوری زندگی علم و فن کی اشاعت، درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور دینی علوم خصوصاً حدیث کی شرح و تحقیق میں گذری،

اتباع سنت کا شوق ان پر شروع ہی سے اتباع سنت کا شوق غالب تھا، اور وہ عقائد و اعمال میں صحابہ و تابعین اور سلف صالحین کے مسلک کو اختیار کرنے کی کوشش کرتے تھے، ان کا خود بیان ہے کہ

"مولانا علیم الدین حسین نگرنہسوی (م ۱۳۰۶ھ) کے پند و نصائح سے بڑا فائدہ حاصل ہوا، اللہ تعالٰے نے اتباع سنت کا شوق ان ہی کے واسطہ سے ہم کو عطا فرمایا ہے، اور میرے رفیق حبیب مولوی تلطف حسین محی الدین پوری نے بھی ان امور میں میری بڑی مدد کی ہے، جزاہما اللہ خیرا"[1]

نکاح جب پہلی دفعہ مراد آباد کے سفر سے، ڈیانواں واپس ہوئے تو ربیع الاول ۱۲۹۴ھ میں چھپرہ (سارن) کے مولوی عبد اللطیف صدیقی کی دوسری صاحبزادی سے ان کا عقد ہوا،

طب پڑھنے کا ارادہ اس زمانہ میں طلبہ دینی علوم سے فراغت کے بعد باعزت زندگی بسر کرنے کے لئے فن طب کی تحصیل کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ نصف صدی پہلے کے اکثر علما کو طب میں بھی، درخور رہتا تھا، مولانا عظیم آبادی کی طبیعت کا زیادہ میلان حدیث کی جانب، تھا، اس لئے ابتداً ان کو طب کی جانب کوئی رغبت نہ ہوئی، مگر میاں صاحب کی تلقین و ترغیب سے ان کو اس کا شوق ہوا، چنانچہ وہ اپنے ایک گرامی نامہ میں مولانا عظیم آبادی کو تحریر فرماتے ہیں۔

نامہ نامی صحیفہ گرامی رسیدہ کاشف مدعا گردید   آپ کا گرامی نامہ ملا مضمون سے آگاہی ہوئی

[1] یادگار گوہری ص ۱۰۴

مگر ما با طبیعت شما در علم دین خصوصاً در فن
حدیث زیادہ ترمرتسخ شدہ است لہذا
در علم دیگر مائل دفعۃً نخواہد بود، انشاء اللہ
تعالے در علم طب بعد جزو دو جزو بتدریج
مناسبت تام خواہد شد، خاطر شریف
جمع دارند و ما برضا و رغبت اجازت
علم طب دادم و دعامی کنم کہ اوواہب
الخیر والبرکت زود تر مراد دلی شمارا فائز
کنایندہ بخیریت تمام بدولت خانہ رسانند[1]

محترم! آپ کی طبیعت علم دین خصوصاً
فن حدیث کی طرف زیادہ مائل ہے اس لیے
دوسرے علم کی طرف توجہ دفعۃً نہیں
ہو سکتی، انشاء اللہ تعالے علم طب میں
ایک دو جزو پڑھنے کے بعد طبیعت پوری
طرح لگنے لگے گی، آپ مطمئن رہیں میں
خوشی سے علم طب پڑھنے کی اجازت
دیتا ہوں، اور دست بدعا ہوں کہ
خدائے تعالیٰ بہت جلد آپ کو دلی
مراد میں کامیاب بنا کر مع الخیر وطن پہنچادے،

غالباً طب پڑھنے کے لیے مولانا شمس الحق صاحب ٹونک تشریف لے گئے تھے،
جیسا کہ میاں صاحب کے دوسرے مکتوب کے اس سوال سے ظاہر ہوتا ہے،

در رفتن ٹونک تحصیل طب یا ادب افتاد؟
یا بطور سیر، ازیں رفتہم اطلاع سازند[2]

اور ٹونک کیوں جانا ہوا؟ طب یا ادب
پڑھنے کے لیے یا مطلق سیر و سیاحت
کے لیے، اسکی بھی اطلاع دیں،

لیکن اپنے علمی کاموں اور درس و تصنیف کی مشغولیتوں کی وجہ سے طب پڑھنے
کا ارادہ ترک کر دیا۔ البتہ اپنے فرزند محمد ادریس صاحب کو طب کی اعلیٰ تعلیم دی اور
وہ ایک کامیاب طبیب کی حیثیت سے مشہور ہوئے،

---

[1] مکاتیب نذیریہ ص ۲۲ [2] ایضاً ص ۲۳ و ۲۴،

سفر حج، ۱۰ رجب ۱۳۱۱ھ کو مولانا ڈیانواں سے حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے۔ اس
سفر میں بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہونے کے علاوہ حرمین کے متعدد اہل فضل و کمال سے
ملاقات اور استفادہ کا موقع ملا۔ جن مشائخ نے سند و اجازت مرحمت کی تھی انکے اسمائے گرامی
حسب ذیل ہیں۔

۱۔ علامہ خیر الدین ابوالبرکات نعمان بن محمود آفندی آلوسی زادہ حنفی بغدادی (م ۱۳۱۷ھ)
۲۔ علامہ احمد بن علی النجدی ثم المکی الحنبلی (م ۱۳۲۹ھ) ۳۔ علامہ احمد بن احمد المغربی
ثم المکی۔ ۴۔ علامہ قاضی عبد العزیز بن صالح مرشد حنبلی ۵۔ علامہ عبد الرحمٰن بن عبد اللہ
سراج حنفی، طائفی، ۶۔ علامہ محمد بن سلیمان حسب اللہ شافعی (۷) علامہ ابراہیم بن احمد
بن سلیمان مغربی، مکی۔[1]

ان علماء سے چھ ماہ تک استفادہ کرنے اور فریضہ حج ادا کرنے کے بعد ۱۰ محرم الحرام
۱۳۱۲ھ کو وطن واپس آئے۔[2]

درس و تدریس۔ میاں صاحب کے یہاں سے جب پہلی مرتبہ ۱۲۹۶ھ میں اپنے وطن واپس
ہوئے تو اور علمی کاموں کے ساتھ ہی درس و تدریس کا مشغلہ بھی اختیار کیا۔ ۱۳۰۳ھ میں دوسری
بار جب وہاں سے واپس آئے تو باقاعدہ مسندِ درس پر رونق افروز ہوئے، ان کے حلقہ درس
میں ملک کے گوشے گوشے سے لوگ آکر مستفید ہوتے تھے، عرب اور ایران کے طلبہ بھی
ہوتے تھے، وہ طلبہ کے ساتھ بڑی شفقت و محبت سے پیش آتے تھے، طلبہ کے قیام و طعام
ان کے لیے کتابوں کی فراہمی اور ضروری اخراجات کا سامان بھی کرتے تھے۔ انکا حلقۂ درس

---

[1] ترجمۃ الخواطر ج ۸ ص ۱۸۰ یادگار گوہری ص ۱۰۶۔ [2] تذکرہ علمائے حال ص ۳۱
[3] یادگار گوہری ص ۱۰۶،

بہت وسیع تھا، میاں صاحب کے بعد کم ہی لوگوں کے حلقۂ درس کو اتنی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی ہوگی۔ مولانا کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے، ان میں سے چند مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں۔

(۱) مولانا احمد اللہ پرتاب گڈھی (۲) مولانا ابو سعید شرف الدین دہلوی (۳) مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی (م ۱۹۴۹ء) (۴) مولانا عبد الحمید سوہدری (م ۱۳۳۰ھ) (۵) مولانا شرف الحق محمد اشرف ڈیانوی[1] (م ۱۳۲۶ھ) (۶) حکیم محمد ادریس ڈیانوی[2] (۷) مولوی ابو عبد اللہ محمد زبیر ڈیانوی (م ۱۳۲۹ھ) مولف یادگار گوہری۔

افتا | میاں صاحب کی خدمت میں رہکر افتا کا کام بھی انجام دیتے تھے، ان کا معمول تھا کہ وہ اپنے ہونہار شاگردوں کو فتوی نویسی کی مشق بھی کراتے تھے، عموماً ان کے پاس جب استفتے آتے تو وہ انہیں مختلف طالب علموں کے حوالے کر دیتے اور خود ان کے جواب ملاحظہ فرماکر تصویب و تصحیح فرما دیتے تھے، مولانا عظیم آبادی نے اپنے سہ سالہ قیام کے زمانہ میں بکثرت فتوے لکھے مگر انکا پتہ نہیں چلتا، "فتاوی نذیریہ" کی جو دو جلدیں چھپی ہیں ان میں صرف چند سالوں ہی کے فتوے شامل ہیں، ان میں مولانا شمس الحق عظیم آبادی کے کچھ مستقل فتوے اور چھ فتووں پر ان کے تائیدی دستخط ثبت ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ طالب علمی ہی کے زمانہ سے ان کو فتوی نویسی میں مہارت ہوگئی تھی، "فتاوی نذیریہ" میں ان کے جو فتوے شامل ہیں وہ بڑے مفصل و مدلل ہیں، بعض بعض فتوے چار چار اور بعض پانچ صفحے کے ہیں۔

میاں صاحب کے یہاں سے واپسی کے بعد بھی برابر افتا کی خدمت انجام دیتے

---

۱ یہ مولانا کے چھوٹے بھائی تھے، ۲ یہ مولانا کے صاحبزادے ہیں،

اور بکثرت فتاوی تحریر فرمائے، مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی کا بیان ہے کہ "زیادہ وقت اسی کار خیر میں بسر ہوتا تھا"[1] افسوس ہے کہ ان کے فتوے محفوظ نہیں رہے، ان کے بعض رسالے استفتا کے جواب میں لکھے گئے تھے، آگے انکا ذکر تصنیفات میں کیا جائے گا۔

وعظ و تذکیر | ڈیانواں میں درس و تدریس کے علاوہ وعظ و ارشاد بھی ان کا خاص مشغلہ تھا، ان کی تقریروں سے بڑا فیض پہنچا، اکثر لوگوں نے غلط عقیدے، مبتدعانہ خیالات، جاہلانہ رسمیں اور فسق و فجور کی عادتیں چھوڑ دیں۔ خود ان کی والدہ ماجدہ نے بھی ان کے وعظ و ارشاد سے متاثر ہوکر اپنی بعض غیر شرعی عادتیں ترک کر دی تھیں۔ محلہ کی اکثر عورتیں بھی ان کے وعظ میں شریک ہوتی تھیں، ان کی نانی کہا کرتی تھیں کہ "تم جس وقت اللہ کی باتیں سناتے ہو، اس وقت نہایت بزرگ معلوم ہوتے ہو"[2]۔

کتب حدیث کی اشاعت | مولانا عظیم آبادی کا سب سے اہم کارنامہ حدیث اور کتب حدیث کی ترویج و اشاعت ہے۔ ان کی دولت اسی مبارک کام کے لئے وقف رہتی تھی، ۵۷ سال کی قلیل عمر میں انھوں نے حدیث کی جو مفید خدمات انجام دیں اس کی مثال اس دور میں ملنی مشکل ہے۔ علامہ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم علامہ ذہبی اور منذری وغیرہ کی متعدد کتابیں اپنے خرچ سے طبع کرائیں، منذری کی مختصر السنن ابن قیم کی تہذیب السنن اور سیوطی کی اسعاف المبطا وغیرہ کو تصحیح و تعلیق کے ساتھ شائع کیا وہ شیخ محمد مچھلی شہری (م ۱۳۲۴ھ) کی تقریباً ۲۵ کتابوں کی اشاعت کے بڑے آرزو مند تھے، مگر ان کے فرزندوں نے مولانا کے شدید اصرار کے باوجود مسودے نہیں دئے، ورنہ مولانا کی توجہ سے وہ بھی شائع ہوگئی ہوتیں[3]

---

۱ الحدیث امرتسر ۳۱ اکتوبر ۱۹۱۹ء ص ۹۔ ۲ یادگار گوہری ص ۹۳۔

۳ تراجم علمائے الحدیث ہند ج ۱ ص ۳۸۰

حدیث کی بعض امہات کتب کی خدمت کی سعادت ان کے حصہ میں آئی، چنانچہ سنن ابی داؤد اور سنن دارقطنی کے مختلف نسخوں کی مدد سے ان کے متون کی تصحیح و مقابلہ کیا پھر مفید تعلیقات لکھکر ان کو شائع کیا۔ سنن ابی داؤد کی مبسوط شرح بھی لکھی اس کا ذکر آگے آئے گا۔

حدیث کی حمایت اور دینی حمیت | حدیث و سنت کی تائید و حمایت کے لیے پوری طرح کمربستہ رہتے تھے، اور ان کی معمولی مخالفت بھی برداشت نہیں کرتے تھے، ڈاکٹر عمر کریم پٹنوی نے جب حدیث، ائمہ حدیث اور امام بخاری کے خلاف زبان طعن دراز کی تو انھوں نے اپنے تلمیذ رشید اور ممتاز عالم مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی سے اس کا جواب لکھوایا، اور اس سلسلہ میں ان کی ہر قسم کی علمی و مالی اعانت بھی کی

مولانا میں بڑی دینی حمیت بھی تھی، اس لیے شریعت کے منافی کوئی بات پسند نہیں کرتے تھے، بدعتوں سے سخت نفرت اور توحید و اتباع سنت کے پرجوش داعی تھے۔ ان کے زمانہ میں ہندوؤں کے اثر سے مسلمان بھی نکاح بیوگان کو بہت معیوب سمجھتے تھے، مگر مولانا نے اس غیر شرعی رسم کو ختم کر کے سب سے پہلے اپنے خاندان میں بیوہ عورتوں کے نکاح کو رائج کیا[1]

ملی و جماعتی خدمات | مولانا شمس الحق صاحب جماعت اہل حدیث کے رکن رکین اور اس کے خاص علم بردار تھے، انکا ذوق اگرچہ خالص علمی تھا، تاہم اکثر جماعتی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش رہتے تھے، دسمبر ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کی تاسیس عمل میں آئی تو اس کے ہر پروگرام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور زندگی بھر اس کی وسعت ترقی

---

[1] یادگار گوہری ص ۱۰۹

کے لئے کوشاں رہے، اس کے جلسوں میں پابندی سے شرکت فرماتے تھے، اس کے انتظام و انصرام کی بعض ذمہ داریاں بھی ان کے سپرد تھیں اور وہ انھیں بڑے شوق اور دلچسپی سے انجام دیتے تھے، مرتے وقت تک کانفرنس کے دہی امین (خازن) تھے، اور انھوں نے اس کا حساب کتاب ہمیشہ بہت صاف رکھا۔[1]

جماعتی سرگرمیوں کے علاوہ وہ مسلمانوں کی بعض علمی و اصلاحی تحریکوں میں بھی شریک رہتے تھے، تحریک ندوۃ العلما کے حامیوں میں تھے اور اس کے دارالعلوم کی ہر قسم کی مالی اور علمی مدد کرتے تھے، دوسرے جماعتی و غیر جماعتی مدرسوں اور اداروں کی بھی امداد کرتے رہتے تھے، مدرسہ اصلاح المسلمین (پٹنہ) کے عرصہ تک سکریٹری رہے، مدرسہ احمدیہ آرہ کے جس کو مولانا ابو محمد ابراہیم آروی نے قائم کیا تھا، اہم رکن تھے، اور اس کی تعمیر و ترقی اور انتظامی امور میں بڑے دخیل تھے،[2] آپ کے گھر کی حیثیت بھی ایک مدرسہ سے کم نہیں تھی، یہاں سیکڑوں طلبہ ان سے مستفید ہوتے تھے، انکی وفات کے بعد اسی کی یادگار میں ان کے صاحبزادے حکیم محمد ادریس صاحب نے جامع ازہر کے نام سے ایک مستقل مدرسہ قائم کیا تھا۔[3]

مولانا دائرۃ المعارف حیدرآباد کے بھی رکن تھے، تہذیب التہذیب اور تذکرۃ الحفاظ وغیرہ ان کے مشورہ سے شائع ہوئیں، مصر کے بعض مطابع بھی کتابوں کی اشاعت میں ان سے رائے و مشورہ لیا کرتے تھے،[4]

فضل و کمال | مولانا کی دینی علوم، معقولات اور ادب وغیرہ پر وسیع نظر تھی طالب علمی ہی

---

[1] الحدیث ۳۱ مارچ ۱۹۱۱ء ص ۴ [2] ایضاً ۲۸ اپریل ۱۹۱۱ء ص ۴ [3] ہندوستان میں اہلحدیث کی علمی خدمات ص ۱۶۵-۱۶۶ [4] الحدیث ۲۸ اپریل ۱۹۱۱ء ص ۴۔

کے زمانہ سے بحث و نظر اور مطالعہ و تحقیق کے عادی تھے اللہ نے ان کو غیر معمولی ذہانت اور قوت فہم سے نوازا تھا، فقہی مذاہب ائمہ کے اختلافات و دلائل پر مکمل عبور رکھتے تھے، ان کے علمی تبحر اور وسعتِ نظر پر ان کی تصنیفات شاہد ہیں، مطالعہ کی کثرت، کتابوں کی مزاولت اور فن حدیث میں غیر معمولی اشتغال کی وجہ سے حدیث پر ان کو مجتہدانہ بصیرت حاصل ہوگئی تھی، اور وہ صحیح و ضعیف، راجح و مرجوح، مرفوع و موقوف، محفوظ و معلل، متصل و منقطع اور حدیث کی دوسری تمام انواع و اقسام کے درمیان نقد و تمیز کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے، ان کے معاصرین میں کم ہی لوگ کتب رجال، ائمہ جرح و تعدیل اور رواۃ کے طبقات وغیرہ سے واقفیت میں ان کے ہم پایہ رہے ہوں گے، وسعت علم و نظر کا یہ حال تھا کہ اگر کسی کتاب میں کوئی غلطی یا معمولی فرق و اختلاف بھی ہوتا تو وہ ان سے مخفی نہ رہتا اور وہ فوراً اس کی تصحیح فرما دیتے تھے، قاضی شوکانی (م ۱۲۵۰ھ) نے نیل الاوطار میں رجال کے جو غلط حوالے دئے ہیں ان کی اپنے ذاتی نسخہ کے حاشیہ میں تردید کر دی ہے۔[1] جامع ترمذی مطبوعہ ہند میں "باب ما یقول اذا خرج من الخلاء" کی سند کے اندر "حدثنا محمد بن اسمٰعیل (البخاری)" کے بجائے "حدثنا محمد بن حمید بن اسماعیل" طبع ہوتا چلا آرہا ہے اس واضح غلطی کی سب سے پہلے ان ہی نے نشاندہی فرمائی۔[2] اور متعدد شواہد و قرائن سے ثابت کیا کہ مطبوعہ نسخہ میں نام صحیح طور پر درج نہیں ہے،[3] اس طرح کی متعدد مثالوں سے ان کی دقتِ نظر، کثرت مطالعہ اور وسعت علم کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا کے فضل و کمال کا انکے معاصرین اور تلامذہ نے بھی مکمل اعتراف کیا ہے مولوی محمد زبیر ڈیانوی لکھتے ہیں۔

علمانے انکی شان میں عربی و فارسی کے متعدد — ولعلما فی حقہ قصائد فی العربیۃ والفارسیۃ کلما

---

[1] الحدیث، امرتسر ۲۸ اکتوبر ۱۹۱۶ء ص ۳ [2] ایضاً [3] مولانا کے بعد علامہ احمد شاکر نے جامع ترمذی پر اپنی تعلیقات کے اندر بھی اس پر تنبیہ کی ہے، مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری کی تحفۃ الاحوذی ج ۱ ص ۱۱ (طبع اول) میں بھی اسکی طرف اشارہ موجود ہے۔

قصیدے لکھے ہیں جو ہدایۃ الطالبین — مذکورۃ فی ھدایۃ الطالبین

الی مکاتیب الکاملین میں مذکور ہیں — الی مکاتیب الکاملین۔[1]

مولانا کی مختلف کتابوں کے آخر میں جو قطعات تاریخ، تاریخ طبع اور اردو، فارسی و عربی کے متعدد قصیدے شامل ہیں، اُن میں بھی ان کے فضل و کمال کا اعتراف کیا گیا ہے[2] اور علمائے اہل حدیث کے علاوہ دوسرے طبقہ و مسلک کے علماء نے بھی ان کی تحسین و تعریف کی ہے۔

اخلاق و عادات

مولانا طبعاً شریف، متواضع اور ملنسار شخص تھے، اس لئے ہر طبقہ و مسلک کے علما اور اربابِ کمال سے ان کے اچھے تعلقات تھے، ان کی طبیعت میں حق پسندی تھی اس لئے دوسرے مسلک کے لوگوں کے کمالات کے اعتراف میں اور اپنے طبقہ کے بعض علماء کی غلط رایوں کی تردید میں جماعتی عصبیت مانع نہ ہوتی تھی، رفع الالتباس میں امام اعظم ابو حنیفہؒ کے علم و فضل کا بڑی فراخدلی سے اعتراف کیا ہے اور بعض مسائل میں اپنے سب سے محترم استاذ میاں صاحبؒ بھی اختلاف کیا ہے۔[3]

انکسار اور فروتنی کی بنا پر اپنی بعض کتابوں پر اپنا نام دینا بھی پسند نہیں کیا، ہر شخص سے خندہ روئی کے ساتھ ملتے۔ ناگوار اور تکلیف دہ باتوں پر بھی چین بجبیں نہیں ہوتے تھے، مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری فرماتے ہیں، "اخلاق کی یہ کیفیت تھی کہ کبھی ان کی پیشانی پر بل نہیں دیکھا بلکہ حدیث شریف "تبسمک فی وجہ اخیک صدقۃ" پر پورے عامل تھے، میں نے اس حدیث کے عامل علما کو کم دیکھا ہے"۔[4]

---

[1] یادگار گوہری ص ۱۱۰ [2] ملاحظہ ہو اعلام اہل العصر، المکتوب اللطیف الی المحدث الشریف، عون المعبود ج ۴، التعلیق المغنی علی سنن الدارقطنی ج ۲، والکلام المبین فی الجہر بالتامین

[3] الحیاۃ بعد المماۃ ص ۱۲۳ و ۱۲۴ طبع اول [4] اہلحدیث ۳۱ مارچ ۱۹۱۱ء ص ۴

بڑے مہمان نواز فیاض طبع اور اہل علم کے نہایت قدر داں تھے، اس لئے ان کے گھر پر علماء و طلبہ کا ازدحام رہتا تھا، ان کا کتب خانہ ان لوگوں کے لیے وقف رہتا تھا اپنی ذاتی کتابیں اہل علم کو بے تکلف "ہدیۃً" یا "عاریۃً" دیدیتے تھے، ان کے پاس جن کتابوں کے نسخے مکرر ہوتے ان کو دوسروں کو دیدینے میں پس و پیش نہ کرتے۔ شرح بخاری کے کئی نسخے ان کے پاس تھے، ان میں سے ایک کتب خانہ اصلاح المسلمین اور دوسرا مولوی محمد صاحب پٹنوی مالک مطبع احمدی کے حوالہ کردیا[1] ان کے اخلاق و اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے مولانا محمد زبیر ڈیانوی لکھتے ہیں۔

ولہ حب شدید مع العلماء	وہ علماء و محدثین اور طلبہ سے بڑی
المحدثین ومع طلبۃ العلم	محبت کرتے تھے ..... راستبازی،
... ومع ذلک کلہ ھو	حیاء، سخاوت، ثقاہت، دیانت
موصوف بالصدق والحیاء	اور امانت و عدالت سے متصف
والسخاء والثقۃ والدیانۃ	اور جمعہ و جماعت کے پابند تھے۔
والامانۃ والعدالۃ وھو	
ملازم للجمعۃ والجماعۃ[2]	

مولانا حکیم سید عبدالحیٔ حسنی رقمطراز ہیں

وکان حلیما متواضعا کریما	وہ بڑے حلیم، متواضع، شریف،
عفیفا صاحب صلاح وطہارۃ	پاکدامن، نیک اور عمدہ طور و
ظاہرۃ، محبا لاہل العلم[3]	طریقہ کے مالک اور اہل علم سے

[1] اہلحدیث ۸ اپریل ۱۹۱۵ء ص ۳ و ۴ [2] یادگار گوہری ص ۱۰۹ [3] نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۱۶۹

محبت کرنے والے تھے۔

مولانا حکیم سید عبدالحیٔ سے ان کی برابر خط و کتابت رہتی تھی، اور حکیم صاحب کو اپنی کتابوں "نزہۃ الخواطر" اور "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند" کی ترتیب و تالیف میں ان کے کتب خانہ سے بڑی مدد بھی ملی۔ وہ خود تحریر فرماتے ہیں۔

وکان یحبنی للہ سبحانہ	وہ مجھ سے اللہ کیلئے محبت کرتے تھے
وکنت احبہ وکان بینی	اور میں بھی، میرے اور ان کے
وبینہ من المراسلۃ ما لم	درمیان خط و کتابت کا سلسلہ
تنقطع الی یوم وفاتہ[1]	انکی وفات کے روز تک جاری رہا،

بعض اور مصنفین نے بھی ان کے علمی تعاون کا اعتراف کیا ہے،

(باقی)

[1] نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۱۶۹

تذکرۃ المحدثین حصہ اوّل

اس میں صحاح ستہ کے مصنفین کے علاوہ دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام مثلاً امام مالک، امام احمد بن حنبل، امام دارمی، اسحاق بن راہویہ، امام حمیدی، امام طحاوی کے حالات و سوانح اور ان کی خدمات حدیث کی تفصیل ہے۔ قیمت

اسکی دوسری جلد زیر طبع ہے، اس میں ابن حبان، دارقطنی، حاکم صاحب مستدرک بیہقی، قاضی عیاض اور امام نووی وغیرہ کے حالات اور انکی خدمات حدیث کا ذکر ہے۔

مؤلفہ۔ ضیاء الدین اصلاحی رفیق دارالمصنفین۔

جرأتِ حق گوئی

از
حافظ محمد نعیم ندوی صدیقی، ایم، اے (علیگ)

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے بندوں کو آتی نہیں روباہی

ڈاکٹر اقبال کا یہ مشہور شعر نہ معلوم کتنی بار پڑھا اور سنا ہو گا۔ لیکن گذشتہ دنوں جب کلیات اقبال کے مطالعہ کے دوران یہ راقم سطور کی نظر سے گذرا تو بالکل ایک نئی زمین اور نئے آسمان کا احساس ہوا، حقیقت یہ ہے کہ شاعر نے نبضِ دوراں پر انگلی رکھکر انسانی نفسیات کے ایک اہم پہلو کی نشاندہی کی ہے، خیر و شر کے وجود سے تو کوئی عہد خالی نہیں رہا ہے خواہ خیر القرون ہو یا عصر حاضر تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ابتدائی صدیوں میں باطل کی ساری شوکت و جبروت کے باوجود پوری جرأت و بے باکی کے ساتھ حق بات کہہ گذرنے کا پہلے جیسا رواج تھا اس نفاق پسندی اور مصلحت اندیشی کے دور میں پورے طور پر اندازہ نہیں کیا جاسکتا ہے،

ایمان کامل اور یقین محکم سود و زیاں کے اندیشہ سے بالاتر ہوتا ہے، اور جلال حق کے سامنے بڑی سے بڑی قوت و عظمت پرکاہ سے زیادہ بے حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ کسی نے شیخ عز الدین بن عبد السلام سے پوچھا کہ آپ کو سلطان وقت کے دربار میں

بیباکی سے گفتگو کرتے وقت کوئی خوف لاحق نہیں ہوتا فرمایا کہ اللہ کی ہیبت ایسی پیش نظر رہتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں مجھے سلطان بلی کی طرح معلوم ہوتا ہے جی چاہتا ہے۔ قارئین معارف کرد و فرمایئے "سنا کر انکے داغہائے سینہ کو تازہ کیا گیا ہے۔

اسلام نے اعلان حق کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ

فاصدع بما تؤمر و اعرض عن المشرکین (حجر، ۱۰)

جو کچھ آپ کو حکم ملا ہے، اسکو آشکارا طور پر سنا دیجئے، اور مشرکین کی مطلق پروا نہ کیجئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر

بہترین جہاد ظالم حکمران کے سامنے حق بات کہنا ہے۔

اور تاکید کی کہ

من رأی منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ وذلک اضعف الایمان۔

[illegible]

تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے تو اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دینا چاہئے، اگر ہاتھ سے اسکی طاقت نہ ہو تو پھر زبان سے اس پر نکیر کرنی چاہئے اور اسکی طاقت نہ ہو تو کم از کم دل سے اسکو برا سمجھنا چاہئے اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے"

صحابۂ کرام نے جان کو ہتھیلی پر رکھ کر اس حکم کی تعمیل کی۔

حضرت ابو ذر غفاریؓ کی حق گوئی تاریخ میں یادگار رہے۔ وہ اعلان حق کی راہ میں کسی خطرہ کی پرواہ نہیں کرتے تھے، بارہا اس کی پاداش میں اتنی مار کھاتے کہ بے دم ہو جاتے، ان کی حق گوئی کی تعریف دربارِ رسالت میں ان الفاظ سے کی گئی۔

"آسمان کے نیچے، اور زمین کے اوپر ابو ذر سے زیادہ حق گو کوئی نہیں" (جامع ترمذی مناقب ابی ذر)

چنانچہ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں جب وہ شام میں تھے۔ تو وہاں کے...

اپنے خطبہ میں فرمایا "اسمعوا و اطیعوا" یعنی اے لوگو سنو اور اطاعت کرو۔ مجمع میں سے ایک بدو اٹھا اور اس نے کہا (لا نسمع ولا نطیع) ہم نہ تو آپ کی سنیں گے اور نہ اطاعت ہی کریں گے، جب تک آپؓ یہ نہ بتا دیں کہ آپ کے جسم کا اتنا لمبا کرتا کیسے بن گیا جب کہ مال غنیمت کی جو چادریں تقسیم ہوئی تھیں ان میں کوئی اتنی بڑی نہ تھی کہ آپ کا کرتا تیار ہو سکے، آپؓ نے یہ سن کر اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ کو اشارہ فرمایا کہ تم اس کا جواب دو انھوں نے کھڑے ہو کر کہا کہ میں نے اپنے حصے کی چادر بھی امیرالمؤمنین کو دے دی تھی اور اس طرح یہ کرتا دو چادروں سے مل کر تیار ہوا ہے۔ یہ سن کر اس بدو نے کہا اب آپ فرمائیے۔ ہم آپ کا حکم سنیں گے۔ اور اس کی اطاعت کریں گے۔ (الفاروق)

حضرت حسن بصریؒ کا شمار کبار تابعین میں ہوتا ہے، وہ اپنی ضرب المثل فصاحت و بلاغت تبحر علمی اور پُر تاثیر تقریر کے ساتھ فضائل اخلاق میں بھی ممتاز تھے، وہ حق بات کہنے میں کسی کی پرواہ نہ کرتے تھے، یہاں تک کہ ایک بار انھوں نے خلیفۂ وقت یزید بن عبدالملک پر برملا تنقید کی، اسی طرح یزید بن ابی المہلب اور ابن الاشعث کی شورش کے زمانہ میں کسی نے اس کے بارہ میں سوال کیا آپ نے فرمایا نہ اس کا ساتھ دو نہ اس کا" ایک شامی نے عرض کیا" اور نہ امیرالمؤمنین کا"۔ یہ سن کر آپ کو غصہ آگیا، پھر ہاتھ اٹھا کر کہا ہاں نہ امیرالمؤمنین کا" حجاج کی سفاکی اور ... شامی مشہور ہے، مگر حسن بصری کی زبان اس کے زمانے میں بھی اظہار حق سے باز نہ آئی۔ (طبقات ابن سعد ج ۷ قسم اول ص ۱۱۹)

اس عہد کے بعد اس سے بھی مشکل زمانہ آیا لیکن کوئی دور بھی ایسے مردان حق آگاہ سے خالی نہیں رہا۔

امام عبداللہ بن عمر دوسری صدی کے ایک مشہور محدث اور فقیہ گزرے ہیں ایک بار انھوں نے ہارون الرشید کو سعی (صفا و مروہ کے درمیان) روک کر اس کی بدعنوانیوں پر سرزنش کی۔

شیخ نے فرمایا ہارون!

کیا تم ان حاجیوں کی تعداد شمار کر سکتے ہو، خلیفہ نے کہا بھلا انھیں کون شمار کر سکتا ہے، یہ سن کر شیخ نے فرمایا اچھا کان کھول کر سن لو"

مسلمانوں میں جو غیر اسلامی شان پیدا ہو رہی تھی، اس پر انھوں نے بے محابہ دار وگیر کی اور اس باب میں حضرت معاویہؓ جیسے صاحب اثر امیر کی بھی پرواہ نہیں کی۔

حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ بہت طویل خطبہ دیا، جس میں فرمایا "ہوشیار رہنا کہ کسی کی ہیبت تم کو اس حق بات کے کہنے سے باز نہ رکھے جو تم کو معلوم ہے، یہ سن کر حضرت ابوسعیدؓ رو دیئے، اور فرمایا۔ افسوس ہم نے ایسی باتیں دیکھیں، اور ہیبت میں آگئے، (الترغیب والترہیب منذری)

اسلامی تاریخ کا ایک عہد سعادت وہ تھا، جب خود خلیفۂ وقت لوگوں کو حق گوئی کی تاکید کرتا تھا، اور چاہتا تھا کہ اس کے کاموں میں اگر کوئی غلطی ہو جائے تو ... لوگ برملا اسے ... کر دیں تاکہ وہ اپنی اصلاح کر کے آخرت کی بازپرس سے محفوظ ہو جائے۔

چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے خلافت کے بعد سب سے پہلا اعلان یہ کیا کہ "لوگو! میں تم پر حاکم مقرر کیا گیا ہوں، اور تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں اچھے کام کروں تو تم میری مدد کرو، اور اگر برائی کروں تو مجھے درست کر دو"

اسی طرح دوسرے خلیفۂ راشد حضرت عمرؓ نے بھرے مجمع میں لوگوں سے یہ سوال کیا کہ اگر میں سیدھی راہ سے ہٹ جاؤں اور کج روی اختیار کروں تو تم کیا کرو گے، مجمع سے کئی آوازیں آئیں۔ اگر تم کج ہو جاؤ گے تو ہم تمھیں سیدھا کر دیں گے۔ یہ سن کر آپؓ نے فرمایا خدا کا شکر ہے کہ ابھی ایسے لوگ موجود ہیں جو مجھے سیدھا کر سکتے ہیں۔

اس عہد روح پرور میں تنقید کی آزادی کا یہ عالم تھا کہ ایک بار حضرت عمرؓ نے

ان میں سے ہر ہر شخص خود اپنی ذات کا ذمہ دار ہے، لیکن تم خدا کے نزدیک ان تمام بندگان خدا کے ذمہ دار ہو" بخدا جب انسان خود اپنے مال میں اسراف کرتا ہے تو وہ لائق تعزیر قرار پاتا ہے، تو پھر اگر وہ عام مسلمانوں کے مال میں فضول خرچی کا مرتکب ہو تو اس کی سزا کس قدر بڑی ہوگی۔ (مرآۃ الجنان جلد اول ص ۳۷۰)

حافظ قبیصہ بن عقبہ (المتوفی ۲۱۵ھ) اپنے علم وفضل کے ساتھ گوناگوں اخلاقی محاسن کا مجموعہ تھے، ارباب سطوت وشوکت کے سامنے حق بات کہہ گذرنے سے کبھی باز نہ رہتے تھے، ایک بار امیر ابودلف کا لڑکا دلف اپنے خدم وحشم کے ساتھ ان سے ملاقات کرنے ان کے گھر گیا۔ لیکن وہ باہر نہیں نکلے۔ کسی نے حاضر خدمت ہوکر عرض کیا "حضرت جبل کا شاہزادہ باہر کھڑا ہے اور آپ باہر نہیں نکلتے" راوی کا بیان ہے کہ شیخ اس عالم میں باہر تشریف لائے کہ ان کی لنگی سے ایک خشک روٹی کا ٹکڑا لٹک رہا تھا، اور فرمایا

من رضی بھذا ما یصنع بابن ملک الجبل

جو روٹی کے اس ٹکڑے پر قانع اور مطمئن ہو اسے شاہزادہ جبل سے کیا غرض

(تذکرۃ الحفاظ ذہبی ۱/۳۴۴)

یہ واقعہ جرأت وبے باکی کے ساتھ قناعت واستغنا کی بھی بہترین مثال ہے،

ابن ابی ذئب کی حق گوئی

حافظ ابن ابی ذئب (المتوفی ۱۵۹ھ) کے صحیفۂ کمال کا سب سے درخشاں باب ان کی جرأت وحق گوئی ہے، کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اعیان سلطنت کے روبرو حق بات کہہ گذرنے سے کبھی گریز نہیں کیا، اور اس بارے میں بسا اوقات وہ اتنا غلو کرتے تھے کہ ان کے عقیدت مندوں کو بڑی تشویش پیدا ہو جاتی تھی، مگر ان کے پائے ہمت میں کبھی لغزش نہیں پیدا ہوئی۔ ان کے متعلق کتابوں میں یہ تصریح ہے۔

کان من اقول اھل زمانہ للحق۔ (تہذیب التہذیب ۹/۳۰۷)

وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے حق گو تھے۔

امام احمد بن حنبل کا قول ہے۔

ابن ابی ذئب اقوم بالحق من مالک عند السلاطین

وہ سلاطین کے سامنے امام مالک سے بھی زیادہ حق گو ثابت ہوئے۔

(خلاصہ تذہیب ذکر ابن ابی ذئب)

ان کے اس وصف کے اظہار کے متعدد واقعات ملتے ہیں۔ ان میں سے دو ایک کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے، ایک مرتبہ زمانہ حج میں خلیفہ مہدی مسجد نبوی میں داخل ہوا تمام حاضرین نے دو رویہ ایستادہ ہوکر اس کا استقبال کیا، اتفاق سے ابن ابی ذئب بھی وہاں موجود تھے، مگر وہ حسب سابق اپنی جگہ بیٹھے رہے، مسیب بن زہیر نے جب ان سے کہا کہ "کھڑے ہوجائیے نا! امیر المومنین تشریف لائے ہیں" شیخ نے بہت سکون اور طمانیت بھرے لہجہ میں فرمایا

انما یقوم الناس لرب العالمین (تاریخ بغداد ج ۲ ص ۳۰۰)

صرف پروردگار عالم کے لیے لوگ کھڑے ہوتے ہیں۔

ان ہی کا ایک دوسرا واقعہ یہ مذکور ہے کہ ایک مرتبہ وہ خلیفہ ابوجعفر منصور کے پاس پاس جاکر سختی کے ساتھ ظلم وجور سے باز رہنے کی تلقین کی منصور نے سب کچھ سن کر گردن جھکالی، اور محمد بن ابراہیم سے کہا

ھذا الشیخ خیر اھل الحجاز (مرآۃ الجنان ۱/۳۴۰)

یہ بزرگ حجاز کے بہترین لوگوں میں ہیں۔

ایک بار خلیفہ منصور نے ان سے دریافت کیا کہ میرے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے شیخ ابن ابی ذئب پہلے تو خاموش رہے۔ لیکن جب خلیفہ نے قسم دلا کر پوچھا تو فرمایا۔

اللّٰھم لا أعلمك الا ظالماً جائراً — بخدا میں تجھے ظالم و جابر کے سوا اور کچھ نہیں سمجھتا ہوں،

خلق قرآن کے مسئلہ میں ابو نعیم کی حق گوئی، خلیفہ مامون الرشید کے آخری عہد حکومت میں خلق قرآن کا فتنہ گرم ہو چکا تھا، معتزلہ کے اثر سے مامون کو اس مسئلہ میں بے حد غلو تھا، چنانچہ وقت کے تمام مشاہیر علماء اور فقہاء اس فتنہ کی زد میں آئے، جیسا کہ معلوم ہے اس ابتلاء و آزمائش کا سب سے زیادہ نشانہ امام احمد بن حنبل کی ذات تھی لیکن مامون اور اس کے بعد معتصم انتہائی جبر و تشدد کے باوجود ان سے اس باطل عقیدہ کا اقرار نہ کرا سکے۔

معتصم باللہ کے عہد میں یہ فتنہ حد سے زیادہ بڑھ گیا۔ اس نے اپنے تمام ممالک محروسہ میں فرامین جاری کر دیئے تھے، کہ علمائے وقت سے زبردستی عقیدۂ خلق قرآن کا اقرار کرا لیا جائے چنانچہ جو ارباب علم و فضل میدان عزیمت و ہمت کے مرد نہ تھے، انھوں نے رخصت پر عمل کرتے ہوئے سر تسلیم خم کر دیا، لیکن بہت سے اصحاب دعوت و عزیمت ایسے بھی تھے، جنھوں نے خلق قرآن کے اقرار کے بدلہ میں طوق و سلاسل اور دار و رسن کو ترجیح دی ان ہی اصحاب عزیمت میں ایک اہم شخصیت حافظ ابو نعیم کی بھی تھی۔

مشہور مؤرخ خطیب بغدادی نے اس فتنہ میں ابو نعیم کے ابتلا کی پوری تفصیل درج کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابو نعیم کوفہ ہی میں تھے کہ فرمان خلافت کے تحت والی کوفہ نے علماء کو طلب کیا ابو نعیم بھی تشریف لے گئے، ان سے پہلے ابن ابی حنیفہ، احمد بن یونس اور ابو غسان وہاں پہونچ چکے تھے۔ والی نے سب سے پہلے ابن ابی حنیفہ سے اقرار کرنے کے لیے کہا، انھوں نے فوراً حکم کی

تعمیل کی۔ پھر اس نے ابو نعیم کی طرف متوجہ ہو کر کہا، دیکھو انھوں نے (ابن ابی حنیفہ) نے بھی اقرار کر لیا ہے، ابو نعیم نے یہ سن کر بڑی بے باکی کے ساتھ کہا کہ میں نے کوفہ میں کم و بیش سات سو شیوخ کو یہ کہتے سنا ہے کہ القرآن کلام اللہ غیر مخلوق (قرآن خدا کا کلام غیر مخلوق ہی) اور یہی میرا بھی عقیدہ ہے خواہ میری گردن سر سے جدا کر دی جائے مگر میں اس عقیدہ سے باز نہیں آسکتا (تاریخ بغداد ج ۱۲/۳۴۹)

حافظ یحیی مصمودی کی جرأت، حافظ یحیی مصمودی جو امام مالک کے عزیز ترین شاگرد اور مؤطا کے مستند ترین راوی شمار ہوتے ہیں مسائل شریعت میں وہ اپنی رائے کا برملا اظہار کرتے تھے انہیں کبھی رعب شاہی مرعوب نہیں کر سکا، ایک بار اندلس کے اموی حکمراں عبد الرحمٰن بن حکم ماہ رمضان المبارک میں کفارہ صوم کا مرتکب ہو گیا۔ فکرمند ہوئی اس نے شہر کے تمام فقہاء کو بلا کر پوچھا کہ اس غلطی کا کفارہ کیا ہے۔ یحیی مصمودی نے فرمایا کہ امیر کو پے در پے دو مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں۔ دربار خلافت سے واپس آنے کے بعد لوگوں نے عرض کیا کہ امام مالک تو اس نوع کے مسائل میں "تخییر" کے قائل ہیں، یعنی ان کے نزدیک کفارہ صوم میں روزہ دار کو اختیار ہے۔ چاہے، غلام آزاد کر دے یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے یا دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے۔ پھر آخر آپ نے دو ماہ کے روزے ہی پر کیوں اصرار کیا۔ یہ سن کر شیخ یحییٰ نے اس کا یہ حکیمانہ جواب دیا کہ

اگر ہم نے امیر کے لیے یہ دروازہ کھول دیا تو اس کے لیے بہت آسان ہو گا کہ روزہ شکنی کرے اور کفارہ میں غلام آزاد کر دے لیکن میں نے اس کے لیے مشکل صورت اختیار کی تاکہ آئندہ وہ اس کی جرأت نہ کر سکے۔ (ابن خلکان ج ۳ ص ۱۴۴)

اندلس کے مشہور اموی حکمراں عبد الرحمٰن الناصر نے جب اپنے یادگار زمانہ شہر مدینۃ الزہرا کی تعمیر میں بیشمار دولت صرف کر ڈالی، اور محل شاہی میں سونے کی اینٹیں لگانی چاہیں تو قاضی قرطبہ

منذر بن سعید سے مسلمانوں کے مال میں خلیفہ کا یہ اسراف بے جا دیکھا نہ جاسکا۔ اور انھوں نے جمعہ کے خطبہ میں اس پر سخت تنقید کی، اور خلیفہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا

"مجھے یہ گمان نہ تھا کہ شیطان اس حد تک آپ پر مسلط ہو سکتا ہے، کہ وہ آپ کو کفار اور خدا کے باغیوں تک پہونچا دے" یہ سن کر الناصر کے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور اس نے قاضی موصوف کو درمیان ہی میں ٹوکتے ہوئے کہا "غور تو کیجئے آپ کیا کہہ رہے ہیں، آپ نے مجھے کفار کے مقام تک پہونچا دیا"

قاضی موصوف نے اسی طرح پُر زور لب ولہجہ میں جواب دیا۔ ہاں میں بالکل درست کہہ رہا ہوں اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے۔

ولولا ان یکون الناس	اگر ایسا نہ ہوتا کہ لوگ ایک امت
امۃ واحدۃ لجعلنا لمن یکفر	بن جائیں تو ہم خدا سے بغاوت اور
بالرحمن لبیوتھم سقفا	کفر کرنے والوں کے مکانات کی
من فضۃ ومعارج علیھا	چھتیں اور سیڑھیاں چاندی کی بنا
یظھرون ولبیوتھم ابواباً	دیتے جن پر وہ چڑھتے۔ اور ان کے
وسررا علیھا یتکئون۔	گھروں کے لیے دروازے اور مسہریاں
(الزخرف — ۳۰)	بنا دیتے جن پر وہ آرام کرتے۔

اس وقت خلیفہ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ اس کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی، اور خدا کے خوف سے اس کا سر جھک گیا۔ اور اس نے فوراً منارے کو گرا کر چاندی کی اینٹوں کی جگہ مٹی سے اس کے دوبارہ بنانے کا حکم دیا۔

شیخ عز الدین بن عبد السلام کا شمار ساتویں صدی ہجری کی بہت باکمال اور باعظمت

شخصیتوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے علم وتقویٰ اور دعوت و اصلاح کے ساتھ حق گوئی و بیباکی میں بھی نادرۂ روزگار تھے۔ ان کی جرأت کا ایک حیرت انگیز واقعہ علامہ سبکی نے یہ نقل کیا ہے کہ عید کے دن قلعہ میں دربار شاہی تھا، بادشاہ پورے تزک و احتشام کے ساتھ سریر آرا تھا، دو رویہ افواج شاہی دست بستہ کھڑی تھیں، امراء حاضر ہو ہو کر آداب و تسلیم بجا لاتے اور زمین بوس ہوتے تھے۔ اس بھرے دربار میں دفعۃً شیخ نے بادشاہ کو نام لے کر خطاب کیا "ایوب! خدا کو تم کیا جواب دوگے، جب پوچھا جائے گا کہ ہم نے تم کو مصر کی سلطنت اس لئے دی تھی کہ شراب آزادی سے پی جائے"، بادشاہ نے کہا "کیا یہ واقعہ ہے؟" شیخ نے بلند آواز سے فرمایا ہاں فلاں میخانہ میں شراب آزادی سے بک رہی ہے، اور دوسرے ناگفتنی کام بھی ہو رہے ہیں، اور تم یہاں بیٹھے داد عیش دے رہے ہو" بادشاہ نے کہا "جناب والا میرا اس میں کوئی دخل نہیں ہے، یہ میرے والد کے زمانہ سے ہو رہا ہے"، شیخ نے فرمایا کہ پھر تم بھی ان ہی لوگوں میں سے ہو جن کا جواب یہ ہوتا ہے۔ "انا وجدنا آباءنا علی امۃ" (یعنی یہ ہمارے باپ دادا کے زمانے سے چلا آرہا ہے) سلطان نے فوراً اس شراب خانہ کی بندش کا حکم جاری کیا۔ (طبقات الشافعیہ ج ۵ تذکرہ عز الدین بن عبد السلام)

امام نووی کی بے باکی

ان ہی حق پرست علماء میں صحیح مسلم کے شارح امام محی الدین نووی بھی ہیں جنھوں نے مصر کے نامور ترک فرمانروا الملک الظاہر بیبرس کے باشندگان شام پر مظالم کے سلسلہ میں اس کو نہ صرف بڑے جرأتمندانہ خطوط لکھے، بلکہ اس سے بالمشافہ گفتگو بھی کی، ان مکاتیب کا یہاں نقل کرنا موجب طوالت ہے لیکن بادشاہ کے مقابلہ میں اُن کی ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے،

شاہ ظاہر تاتاریوں سے جنگ کرنے کے لئے مصر سے نکلا اور شام پہنچا، اور وہاں کے

علماء سے یہ فتویٰ حاصل کیا کہ اس جنگ کی تیاری کے لئے رعیت کے اموال پر قبضہ کر سکتا ہے۔

جب علماء کا فتویٰ اس کے پاس پہنچا تو اُس نے دریافت کیا کہ علماء میں سے کوئی باقی تو نہیں رہا لوگوں نے کہا صرف شیخ محی الدین نودی نے دستخط نہیں کئے ہیں، ظاہر نے شیخ کو حاضر کرنے کا حکم دیا، جب وہ آئے تو اُن سے کہا "دوسرے علماء کی طرح آپ بھی دستخط کر دیں" انھوں نے انکار کیا،

ظاہر نے پوچھا، آپ دستخط سے انکار کیوں کر رہے ہیں

امام نودی نے فرمایا، میں جانتا ہوں کہ تم آمیر بندقدار کے غلام تھے اور تمھارے پاس کچھ نہ تھا۔ پھر اللہ نے تم پر احسان کیا۔ اور تمھیں بادشاہت عطا کی۔ میں نے سنا ہے کہ تمھارے پاس ایک ہزار غلام ہیں، اور ہر غلام کے پاس سونے کا کمر بند ہے۔ دو سو لونڈیاں ہیں اور ہر لونڈی کے پاس زیورات کا ایک بکس ہے، جب تم یہ تمام دولت صرف کر لوگے اور تمھارے غلاموں اور لونڈیوں کے پاس سوت کے کمر بند اور معمولی لباس کے سوا کچھ نہ بچے گا تب میں تمھیں فتویٰ دوں گا کہ رعیت کے مال پر ہاتھ ڈالو۔

یہ سن کر ظاہر غصہ سے بے تاب ہو گیا اور حکم دیا کہ تم میرے شہر دمشق سے فوراً نکل جاؤ۔

امام نووی نے فرمایا بہتر ہے، یہ کہکر شیخ شام کے ایک دیہات "نوی" میں جاکر مقیم ہو گئے، شیخ کے جانے کے بعد دوسرے فقہاء نے بادشاہ سے عرض کیا کہ شیخ محی الدین ہمارے کبار علماء و صلحاء میں شمار ہوتے ہیں اور عوام ان ہی کی اقتدار کرتے ہیں، ان کا دمشق سے نکل جانا مناسب نہیں ہے، یہ سن کر ظاہر نے شیخ کی واپسی کا حکم صادر کیا۔ لیکن جب بادشاہ کا فرمان شیخ کو ملا تو انھوں نے جانے سے انکار کیا، اور فرمایا کہ جب تک ظاہر دمشق میں موجود ہے

میں وہاں نہیں جا سکتا۔ اس واقعہ کے ٹھیک ایک ماہ بعد ظاہر کا انتقال ہو گیا۔

ہندوستانی تاریخ میں حق گوئی کی مثالیں

جرأت، صاف گوئی، حق پرستی اور بیباکی کی یعبیر افروز مثالیں پیش کرنے والے "جوانمرد" تاریخ کے ہر دور میں بکثرت پائے جاتے رہے ہیں، سطور بالا میں دوسرے ممالک کی ایک جھلک دکھانے کے بعد اب ذیل میں ہندوستان کے اسلامی عہد سے بھی اس کی کچھ مثالیں پیش کر رہا ہوں۔

شمس الدین حق گو کرمانی،

مالوہ اور مانڈو کے سلطان محمود خلجی کا معمول تھا کہ وہ اپنے لباس اور غذا کے لیے خود کوئی کام کرتا تھا، وہ وہی چاول گیہوں اور کپڑے استعمال کرتا، جو اس کو جائز طریقے سے حاصل ہوتے تھے، سفر میں لکڑی کے تختوں پر بوئی ہوئی سبزیاں اس کے ساتھ رہتیں، ایک بار وہ احمد آباد بیدر پر حملہ آور ہوا جس کا فرمانروا بہمنی خاندان کا نظام شاہ تھا، اس حملہ کے بعد احمد آباد کے ایک بزرگ مولانا شمس الدین حق گو کرمانی کی خدمت میں حاضر ہوا سلطان نے ملاقات کے دوران میں کہا میرے پاس ترکاری ختم ہو گئی ہے، اس سے بہت پریشانی ہے۔ لکڑی کے تختوں پر ترکاری پیدا کرتا ہوں مگر وہ شاہی باورچی خانے کے لیے کافی نہیں ہوتی اگر کسی شخص کے پاس حلال روپے سے خریدی ہوئی زمین موجود ہو تو مجھے بتائیے تاکہ میں اس کو اچھی قیمت دے کر سبزیاں خرید دوں" یہ سن کر مولانا شمس الدین حق گو نے فرمایا "اے سلطان! ایسی بات نہ کرو جس کو سن کر تمھارا مذاق اڑایا جائے۔ مسلمانوں کے ملک میں آکر ان کے مال و اسباب کو تباہ و غارت کرنا، ان کے گھروں اور آبادیوں کو ویران کرنا اور اس کے بعد ترکاریوں کی خرید و فروخت میں حلال و حرام کا یہ خیال قابل مضحکہ نہیں تو کیا ہے، ؟ یہ طرز عمل خدا ترسی سے بہت دور ہے، یہ سن کر سلطان کی آنکھوں میں آنسو آگئے، اور اس نے کہا آپ سچ کہتے ہیں۔ (تاریخ فرشتہ ۱/۳۴۶)

مولانا عبداللہ اجودھنی | سلطان سکندر لودھی کی شہزادگی کے زمانہ میں ہندو کرکشیتر کے کنڈ میں آکر اشنان کیا کرتے تھے۔ جو ایک مذہبی میلہ بھی بن گیا تھا، سکندر لودھی نے اس کو روک دینے کی کوشش کی۔ اس کے لئے اس نے علماء کا ایک محضر طلب کیا۔ جس میں ملک العلماء عبداللہ اجودھنی بھی شریک ہوئے۔ تمام علماء نے ان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ ان ہی کی رائے حرفِ آخر ہے، سکندر لودی مولانا عبداللہ کی طرف مخاطب ہوا تو انھوں نے پوچھا "کرکشیتر کیا چیز ہے؟" جواب ملا کہ ایک حوض ہے جہاں ہندو ہر شہر سے آکر غسل کرتے ہیں۔ مولانا نے پوچھا "کب سے یہ رسم جاری ہے"۔ جواب ملا "قدیم رسم ہے"۔ مولانا عبداللہ نے فتویٰ دیا کہ "کسی قدیم معبد کو تباہ کرنا جائز نہیں ہے، سکندر لودی نے اس فتوی کو اپنی منشا کے خلاف پایا ...... اور غصہ سے خنجر بکف ہو کر کہنے لگا یہ جانبدارانہ فتوی ہے۔ میں پہلے تجھے مار دونگا۔ پھر کرکشیتر کو تباہ کرونگا۔ مولانا نے بڑی دلیری سے جواب دیا:۔

"اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کوئی نہیں مرتا، جب کوئی ظالم کے پاس آتا ہے تو وہ اپنی موت کے لئے پہلے سے تیار ہو کر آتا ہے، ہر چہ باد اباد، آپ نے مجھ سے دریافت کیا میں نے شرعی مسئلہ بیان کر دیا، اگر آپ کو شریعت کی پرواہ نہیں ہے تو پھر پوچھنے کی حاجت ہی کیا تھی؟"

یہ سن کر سلطان کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا، جب مجلس برخاست ہو گئی تو سکندر نے مولانا سے کہا :-

"میاں عبداللہ! آپ گاہے گاہے مجھ سے ملاقات کرتے رہیں"

(بزم رفتہ کی سچی کہانیاں بحوالہ
واقعاتِ مشتاقی ص ۹۶)

دیوانِ حافظ

(ایک ہندوستانی شاعر حافظ کے دیوان کا ایک نادر مخطوطہ)

از

جناب کبیر احمد صاحب جائسی لکچرر شعبۂ فارسی - جامعہ ملیہ دہلی

چند ماہ قبل راقم پروفیسر اظہر انصاری صدر شعبۂ تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ساتھ ذاکر حسین لائبریری کے نئے مخطوطات کی فہرست بنا رہا تھا، تو ایک مخطوطہ نظر سے گذرا جس پر دیوان حافظ لکھا ہوا تھا، یہ حافظ ایک ہندوستانی شاعر ہے، مخطوطہ ناقص الآخر ہے، ترقیمہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ کہنا مشکل ہے کہ کب لکھا گیا ہے، مگر کاغذ اور روشنائی دیکھ کر اندازہ ہوا کہ یہ زیادہ سے زیادہ پچاس ساٹھ سال قبل نقل ہوا ہوگا، اور اگر بہت قدیم ہوگا تو اسکی کتابت تیرھویں صدی عیسوی کے آخر میں ہوئی ہوگی، مخطوطہ میں فارسی اور اردو کلام دونوں درج ہیں، ناقص الآخر ہونے کی وجہ سے ردیف ق سے ی تک کی اردو غزلیں اس میں نہیں ہیں،

اس مخطوطہ کو دیکھ کر خیال ہوا کہ مختلف تذکروں کی مدد سے اس شاعر کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کی جائے، اس سلسلہ میں عقد ثریا، تذکرہ ہندی، ریاض الفصحا، گلشن بیخار، نکات الشعراء، اور گلشن ہند کا جائزہ لیا گیا، مگر ان میں اس شاعر کا حال کچھ نہ معلوم ہو سکا،

احتیاطاً بارہویں صدی ہجری کے تذکرے مثلاً تذکرہ حسینی، سرو آزاد اور خزانہ عامرہ کا بھی مطالعہ کیا گیا، مگر اس نام کا کوئی شاعر نہ ملا

لغت نامہ دہخدا اور تذکرہ صبح گلشن تالیف ۱۲۹۵ھ میں حافظ کے نام سے ایک شاعر کا ذکر نظر سے گذرا، لغت نامہ دہخدا میں ہے :-

"حافظ : سید اکبر علی یکے از شعراے سادات ہندوستان، او خواہر زادہ و شاگرد مولوی اکرام الدین حیران است" و نسبت وے بجعفر برادر امام حسن عسکری میرسد، و سید جلال الدین بخاری یکے از اجداد وے بودہ و آبا و اجداد او در دہلی، از مشائخ طریقت بودند او راست

لرزہ می افتد ز ماہی تا بماہ آسمان
نالہ ام چون از دل پر اضطراب آید برون[1]

صبح گلشن میں ہے :-

"حافظ : سید اکبر علی، حافظ قرآن است ہمشیر زادہ و شاگرد مولوی اکرام الدین حیران، نسبش بحضرت جعفر برادر امام حسن عسکری منتہی میشود و بچند واسطہ تا سید جلال الدین بخاری میرود، آبا کرام و اجداد عظام حافظ مشائخ طریقت گذشتہ اند و علت اکثری از ایشان بخاک دہلی سرشتہ، والد حافظ سید محمد علی ابن سید نبی الدین در قصبہ جالندھر مضافات صوبہ لاہور توطن گزید حافظ ہمانجا متولد گردید"

دو پارہ حافظا بیدل دل قمر گردد　　اگر ز پردہ بت مہ جبیں شود پیدا

نمی دانم چہ لذت داشت یارب آب شمشیرش
کہ چشم زخم دیگر داشت بسمل گشتہ تخچیرش

لرزہ می افتد ز ماہی تا بماہ آسمان
نالہ ام چوں از دلم پر اضطراب آید بروں

رُباعی

جاناں دم نزع دیدنی ہست بیا　　احوال دلم شنیدنی ہست بیا
اے دادہ رُخ تو آب رنگی گل را　　رنگ رُخ ما پریدنی ہست بیا[1]

مذکورہ بالا دونوں تذکروں میں حافظ کو زیر نظر مخطوطہ کا شاعر نہیں قرار دیا جاسکتا، اسکی وجہ تو یہ ہے کہ لغت نامہ دہخدا میں جو شعر درج ہے اس کی زمین ردیف و قوافی میں زیر بحث حافظ کی بھی ایک غزل موجود ہے، لیکن یہ شعر اس میں نہیں ملتا، اسی طرح صبح گلشن میں جو رُباعی اور مزید دو شعر درج ہیں، وہ بھی پیش نظر مخطوطہ میں نہیں ہیں، اس کے علاوہ زیر بحث حافظ اپنی غزلوں میں جگہ جگہ اپنے پیر کا نام لکھتا ہے، مگر لغت نامہ دہخدا اور صبح گلشن کا حافظ کسی کا مرید نہیں معلوم ہوتا، اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ وہ کسی کا مرید رہا ہوگا تب بھی یہ جانے بغیر چارہ نہیں ہے، کہ اس کو اپنے پیر سے غیر معمولی ارادت نہیں تھی اسی وجہ سے تذکرہ نگاروں نے اس کے پیر کے ذکر سے احتراز کیا ہے،

ذاکر حسین لائبریری میں موجودہ تذکروں میں گلستان سخن ہی ایک ایسا تذکرہ ہے جس میں شاعر کا ذکر ملتا ہے اسکی تکمیل ۱۲۷۴ھ میں ہوئی تھی، لوح کتاب کے مطابق اسکی

تربیت صابر گورگانی نے دی، لیکن اس زمانہ کے بہت سے لوگوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ یہ تذکرہ صہبائی کا لکھا ہوا ہے، حقیقت حال کچھ بھی ہو، اس تذکرہ سے حافظ کے بارے میں حسب ذیل معلومات فراہم ہوتے ہیں،

"حافظ تخلص خدا طلب صوفی مشرب سراپا آگاہ معارف اند، بادہ یادگار سلف حافظ مشرب، اس جزو زمان میں خاکساری اور نفس شکنی اس صاف دل و پاک اعتقاد پر ختم تھی، کمان تسلیم سے الف قد کو دال بنا دیا تھا، اور رکوع و سجود کے شوق میں منار قامت کو محراب کر دیا تھا، موافق اس قول کے کہ المومن مرآۃ المومن" یعنی مومن سب کو اپنا سا سمجھتا ہے، وہ ہر کسی کو نیک سمجھتا اور اپنے سے بہتر جان کر کمال تواضع اور فروتنی سے پیش آتا ہے، علم موسیقی میں مہارت حیث اور اس فن کی سمجھ بہت درست، جنتر اور بین بجانے میں دستگاہ تمام، خیال اور دھرپت گانے میں قدرت مالا کلام مگر وہ سب مضامین عرفان سے مالا مال ہوتے ..... اور وہ راگ ان معانی لطیف کی مدد سے عارف کو مدارج علیا تک لے پہونچتے، گویا یہ شعر مولانا اشرف العارفین جلال الدین رومی قدس سرہٗ کا اسی کے نغمے کی شان میں ہے،

ایں زمزمہ مرکبیت مرد وح ترا   بردارد و خوش بعالم بار برد

شعر گوئی کی طرف بھی توجہ بہت فرماتا، اور اس کے پردے میں بھی وہی راگ گاتا، سوز سینہ ثبت ان ابیات میں شمع افروز اور داغ محبت مجمر اوراق میں عود سوز، ہرچند کہ وہ لوگ مائدۂ سخن سے لذت یاب اور لطف شعر سے آشنا ہیں اس کے دست پخت طبیعت سے مزہ نہ اٹھاتے، لیکن اہل مذاق کو ان معانی کی لذت اور ان مضامین کی کیفیت اپنے سے بیگانہ کر دیتی تھی، از بسکہ یہ قوال اس کے دل کے اسرار تھے، ارباب باطن کے سوا اس سے کم کسی کو احتظاظ ہوا، سچ ہے کہ حال کو اہل حال ہی خوب سمجھتا، شاہ نظام الدین معروف شاہ جی کہ تونگر صورت درویش سیرت، شاہ ور دنیا ظاہر و فقیر باطن تھے ہمیشہ اس صحبت فیض منقبت کو مغتنم جانا گئے، اور بعد اس کی وفات کے اپنے نفس واپسیں تک صرف افادات پیشیں کو آشنائے زبان کرتے رہے، ایک بدمست ظاہر اور ہوشیار باطن میرا دوست تھا، کہ فی الجملہ مجھ کو اس سے اعتقاد اور سوز دل دگمد از باطن مثل شمع اس کے ظاہر سے ٹپکتا تھا، میں نے اس پاک باطن نیک کردار کی زبان سے یوں سنا کہ ایک روز صوفیان حقیقت شناس کا ہنگامہ گرم تھا، اس جلسے میں اس روشن ضمیر نے ایک رباعی عارفانہ پڑھی، اور سب حلقے کو ایک حال طاری ہوا، اس جگہ ایک لڑکا سات آٹھ برس کا بھی حاضر تھا، اس کا بھی وہی احوال ہو گیا، اور جب مجلس تمام ہوئی دوپہر کے بعد اسکو ہوش آیا، مرزا بیدل درست فرماتے ہیں

ع : حرف ایں طائفہ سحر بیان اعجاز ست [1]"

صابر گورگانی کی اس طویل عبارت آرائی کے باوجود اس بات کا مطلق پتہ نہیں چلتا کہ اس شاعر کا کیا نام تھا، کس خانوادہ سے تعلق رکھتا تھا، کہاں کا رہنے والا تھا، کب مرا، کس طرح زندگی بسر کی، تعلیم کیسی اور کہاں تک ہوئی، اسکے پیر شاہ جی کس سلسلہ سے منسلک تھے، اُن کا انتقال کب ہوا، مذکورہ اقتباس سے یہ نتائج ضرور اخذ کئے جا سکتے ہیں،

۱۔ تذکرہ گلستان سخن کی ترتیب کے زمانے میں شاعر زندہ نہیں تھا، ورنہ اس کا تذکرہ ماضی بعید کے صیغہ میں نہ ہوتا،

---

[1] گلستان سخن ص ۱۹۸ ۔ ۱۹۹،

۲۔ گلستانِ سخن میں جس شاعر کے حالات درج کئے گئے ہیں، اس کو موسیقی میں ماہرانہ دسترس حاصل تھی، جس سے وہ اسرارِ حقیقت کی پردہ کشائی کرتا رہا۔

۳۔ اس کے کلام میں جن اسرار حقیقت کا ذکر ہوتا عام افراد اپنی کم فہمی کی وجہ سے اس سے حظ نہ اٹھا پاتے، (ممکن ہے اسی وجہ سے تذکروں میں اُن کا ذکر نہیں ملتا، اور صرف اہلِ حال افراد ہی اس کے اشعار کے معانی و مطالب سے لطف اٹھاتے ہیں،)

۴۔ اُن کے پیر کا نام شاہ نظام الدین تھا، جو شاہ جی کے نام سے مشہور اور قوی ہیکل فرد تھے،

۵۔ اُن کے پیر کو نظام الدین پانی پتی نہیں قرار دیا جا سکتا، نظام الدین پانی پتی کے بارے میں "پانی پت اور بزرگانِ پانی پت" میں مرقوم ہے کہ اُن کے والد شیخ عثمان زندہ پیر کے نام سے اور دادا شیخ عبدالکبیر بالا پیر کے نام سے مشہور تھے، اُن کی ولادت ۱۰۳۶ھ میں اور وفات ۱۱۰۳ھ میں ہوئی، انتقال کے وقت اُن کی عمر ۶۷ سال تھی، اگر زیر نظر حافظ کے پیر نے اتنی لمبی زندگی پائی ہوتی تو صابر گورگانی اسکی طرف ضرور اشارہ کرتے، اس سے قطع نظر صابر گورگانی اپنے ایک دوست کا حوالہ دیتے ہیں، جو پیر صاحب کی اس مجلس میں شریک تھا جس میں اُن کے ایک رُباعی پڑھنے پر ایک خورد سال لڑکا "مست ہو گیا تھا، جیسا کہ معلوم ہے، شیخ نظام الدین پانی پتی کا انتقال ۱۱۰۳ھ میں ہوا تھا، اور صابر گورگانی کا تذکرہ ۱۲۶۷ھ میں مکمل ہوا عقلاً یہ محال نظر آتا ہے، کہ گیارہویں صدی ہجری کی ابتدا کے کسی بزرگ کو تیرہویں صدی ہجری کے نصف آخر کا کوئی شخص دیکھ سکے، اور اسکی محفل میں بیٹھ سکے، اس لئے ہمارا خیال ہے کہ یہ شاہ نظام الدین، شیخ نظام الدین پانی پتی سے الگ کوئی صوفی ہوں گے، جن کے بارے میں ہم کو کوئی علم نہیں ہے،

اس مخطوطہ کے مطالعہ سے علم ہوتا ہے، کہ حافظ سلسلۂ صابریہ چشتیہ سے منسلک تھے انھوں نے

حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ و حسینؓ، معین الدین چشتیؒ اور سید محمد یعقوب بدخشانی کی مدح میں ایک ایک قصیدہ لکھا ہے، شیخ عبدالقادر جیلانی، علاء الدین صابر اور شاہ محمد نظام پانی پتی کی مدح میں کئی کئی قصائد ملتے ہیں، سب سے اہم بات یہ ہے کہ نظام پانی پتی کی مدح میں قصیدہ اس عنوان سے شروع ہوتا ہے،

در مدح شیخ المشائخ زبدۂ اولیا، واصلین حضرت شاہ محمد نظام پانی پتی،

اس عنوان اور متن قصائد کی وجہ سے اول اول یہ گمان ہوا کہ شاید یہی نظام الدین حافظ کے پیر ہوں مگر اُن کے نام سے دو وجہوں سے صرف نظر کرنا پڑا، اول تو یہ کہ اُن کا انتقال گیارہویں صدی ہجری کے اوائل میں ہوا ہے، اور گورگانی کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ حافظ تیرہویں صدی ہجری کے شاعر تھے، دوم یہ کہ پانی پت کے بزرگ شیخ نظام الدین کے نام سے یاد کئے جاتے تھے، نہ کہ شاہ نظام الدین کے نام سے، اس وقت گمان غالب ہے کہ اس مخطوطہ کے مرتب نے پانی پتی کا اضافہ اپنی طرف سے کر دیا ہے اور یہ تمام کے تمام قصائد حافظ نے اپنے پیر شاہ نظام الدین کی مدح میں لکھے ہیں، خود حافظ کے کلام میں جن نظام الدین کا حوالہ بار بار آتا ہے وہ شاہ نظام الدین ہیں، شیخ نظام الدین نہیں، مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں،

حافظ شوریدہ را یک نظر شاہِ نظام　　　منزل و ماوائے دیگر کار و انی دیگر است

مرد و پیر مغاں شاہ نظام مقتدا　　　مسکینِ حافظ بے نوا و نی غلام کوئے اوست

ـــــــ ۰ ـــــــ

مرد ر بادہ چو خواہی بجز شاہ نظام　　　مزید عشق نہ حافظ شراب خوار طلب

ـــــــ ۰ ـــــــ

ببین شہ نظام الدین بنازد حافظ مسکیں　　　کہ در بارہ مصائب ہا دل چوں کوہ مکین دارد

ـــــــ ۰ ـــــــ

با نظام شاہ دین ایں خستہ را فریاد رس　　　چوں حافظ بی خانماں من تشنۂ جامم ہنوز

حافظ نے جہاں جہاں بھی اپنے پیر کا ذکر کیا ہے ان کو شاہ نظام یا شہ نظام کے نام سے یاد کیا ہے، وہ کہیں بھی انکو شیخ نظام ... نہیں کہتے، اسی وجہ سے ہمارا خیال ہے کہ مرتب مسودہ کی غلطی سے نظام الدین کے نام میں پانی پتی کا اضافہ ہو گیا ہو گا، حافظ کا صابری ہونا بھی انہی کے اشعار سے ثابت ہوتا ہے،

صرف دو اشعار مثال کے طور پر درج کئے جاتے ہیں،

افتادہ بدرِ احمد صابر حافظ — یک نظرِ لطف بہ بمندیّتِ عریانی را

قطرۂ از جامِ دورِ صابری آمد نصیب — گشت حافظ مہرِ رخشاں گاہ اس گاہ حبیب

زیر بحث مخطوطہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حافظ کی بعض غزلیں بڑی صاف شستہ رواں اور جذبات سے پُر ہیں، مگر اسی کے ساتھ بہت سی ایسی غزلیں بھی ہیں جن کو صرف "است" اور "بود" لگا کر فارسی بنا لیا گیا ہے، ان غزلوں میں نہ کوئی کیف ہے، اور نہ نمک، نری قافیہ پیمائی اور تک بندی معلوم ہوتی ہیں، اس مخطوطہ کا ہم نے جو سرسری مطالعہ کیا ہے وہ اسرارِ حقیقت معلوم کرنے کے لئے نہ تھا، بلکہ اس کی شاعرانہ قدر و قیمت کا اندازہ لگانا مقصود تھا، اس نقطۂ نظر سے حافظ کے کلام کا جائزہ لینے کے بعد مناسب یہی معلوم ہوا کہ ان کی کچھ چیدہ چیدہ غزلیں شائع کر دی جائیں، نیز ان کے بارہ میں جو شکوک و شبہات کی نشاندہی بھی کر دی جائے، تاکہ اہلِ نظر کی امداد و اعانت سے اس شاعر کی اصلیت کا پتہ چلایا جا سکے، اور اس کے عہد کی تعیین کے بعد اس کے بارے میں جو کچھ معلومات فراہم ہو سکیں ان کو سامنے رکھ کر پیشِ نظر مخطوطہ کا ایک ناقدانہ متن مرتب کر دیا جائے، ان سطور کی اشاعت کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اگر اس شاعر کا کوئی دوسرا مخطوطہ کسی کتب خانہ میں محفوظ ہو گا تو سطورِ ہذا کی اشاعت کے بعد اس کا بھی پتہ چل جائے گا، اور اس نسخے کی مدد سے متن کو مرتب کرنے میں آسانی ہو گی، نمونے کے طور پر حافظ کی چند غزلیں درج کی جاتی ہیں،

(۱)

برخیز یک دم ساقیا بخشا در میتی نہ را، — یک جرعہ بر ما بخش کن آن بادۂ مستانہ را

بنگر گروہِ عاشقاں بر درگہت زاری کناں — دریاب از بہر خدا چندیں دلِ دیوانہ را

بزمِ طرب را ساز کن، جامی بمستاقاں بدہ — برگیر سازِ عقل و دیں در دست کن پیمانہ را

اے ناصحِ پژمردہ دل پندے بمستاں می دہی — نادان چہ دانی ماجرا جام و سبو خمخانہ را

زنہار ہرگز کے خلد خارِ ملامت در دلم — از سوختن بنود خبر مسکیں دلِ پروانہ را

بگذار ایں عقل و خرد در بزمِ رنداں شو دلا — شاید کہ از فیضِ خدا رہ یابی آن میخانہ را

اے حافظا مسکیں گدا رو بر درِ شاہِ نظام

از صدقِ جاں کن التجا بگذار ایں افسانہ را

(۲)

اے جانِ من جانانِ من ہستم دعا گوئے شما — عمرے شد اندر آرزو افتادہ در کوئے شما

چوں می نہ پرسی حالِ من اے شاہ فرخ فالِ من — ذکرِ تو قیل و قالِ من بس زندہ بر بوئے شما

من کشتۂ نازِ توام سرگشتہ از سازِ توام — دیوانہ جانِ بازِ توام قربان ہر سوئے شما

من کیستم تا دم زنم یا دین و دل برہم زنم — صد عالمے حیران شدند از چشمِ جادوئے شما

صدہا فلاطوں بو علی صدہا سعید و ہم شقی — چنداں پریشان و خجل از زلف و گیسوئے شما

در دو جہاں غوغائے تو در انس و جاں جویائے تو — افتاں و خیزاں ہر کسے در جستجوئے شما

بیچارہ مسکیں ہر زماں حافظ فقیرِ ناتواں

در زیرِ چوگانِ عشقِ تو سرگشتہ چوں گوئے شما

(۳)

مست شوقِ وصلِ یارم روز و شب — زاں شرابِ اندر خمارم روز و شب

گر میسر نیستم آن بادۂ صاف — دُرد نوش و بادہ خوارم روز و شب

من بہر سو حسنِ او بینم دلا — زاں بہر شے در نظارم روز و شب

چوں گدائیم بر درِ پیرِ مغاں — شاہِ جملہ شہر یارم روز و شب

ہمچو یاراں در ہوائے عشقِ او — از دل و جاں خوں ببارم روز و شب
تا مگر باشم سگِ کوئے مغاں — دل شکستہ بندہ دارم روز و شب
خاکِ راہِ آن خراباتِ مغاں — چشم اندر سرمہ دارم روز و شب

حافظا از آتشِ عشقِ صنم
تا ابد مانند نارم روز و شب

(۴)

عاشقاں را در رہِ عشق از ملامت عار نیست — ہیچ گل باشد کہ ہمراہش سنانِ خار نیست
کعبہ و بتخانہ نزدِ عاشقاں باشد یکے — در طریقِ عاشقی این تفرقہ درکار نیست
مذہب و آئینِ عشق این جملہ یکرنگی بود — راہ و رسمِ عاشقاں این سبحہ و زنار نیست
ناصحا بر عاشقاں صد زخمِ رسوائی مزن — کافرِ عشقیم با اسلام و دینم کار نیست
عاشقاں را گر کسے محرم نباشد گو مباش — بیدلاں را ہمدمی جز سایۂ دیوار نیست

زادہ در داست حافظ ہم غذا ایش خونِ دل
از ہزاراں کوہِ غم اورا جوے آزار نیست

(۵)

مژدہ اے دل کہ شبِ فرقتِ یار آخر شد — غمِ تنہائی و رنجِ شبِ تار آخر شد
صولتِ بادِ خزاں بود بگلزارِ دلم — شکر صد شکر کہ از بادِ بہار آخر شد
خارِ ہجراں کہ بصد نوک جراحت میکرد — ہم ز اقبالِ گلِ روئے نگار آخر شد
شمہ از لطفِ نظرِ ساقیِ ما ہست کہ گرد — ہمہ صد غصہ و تشویشِ خمار آخر شد
حالیا آن مے و میخانہ و بادف و چنگ — کہ ز خورشیدِ جہاں تابِ غبار آخر شد

گرچہ زاہد بہمہ عیب کند حافظ را
لیک صد شکر کہ آں غصۂ یار آخر شد

(۶)

دارد دلِ دیوانہ سیرِ گلستانے دگر — باشد درونِ سینہ ام صد موج طوفانی دگر
اے زاہد گم کردہ پے تا کے پریشاں می شوی — در سیرِ کعبۂ دل ببیں قطعِ بیابانی دگر
در مذہبِ عشاقِ حق از کافری بس چارہ نیست — ہر دم گرد سازند جا با مسلمانی دگر
شوریدگانِ عشق را چوں ہیچ صبح و شام نیست — ہر لحظہ دارند اندرِ دل خورشیدِ تابانی دگر

حافظ بعشقِ آں صنم باشد پریشاں دمبدم
ہر لحظہ می سازد جدا قطعِ بیابانی دگر

(۷)

من دولتِ دردِ تو بدرماں نفروشم — کفرِ سرِ زلفِ تو بایماں نفروشم
صد خارِ فراقت بدلم گر نخلد ہرگز — در باغ چو بلبل بصد افغاں نفروشم
عیشِ دو جہاں بغمِ عشق ندانم — ایں جنسِ گراں مایہ بس ارزاں نفروشم
من رندِ نظر باز غلامِ دہ صاحبہ — ہرگز بکسے پاکیِ داماں نفروشم
گر ناصحِ بیہودہ مرا عیب کند چیست — از بہرِ یکے لقمہ صد ایماں نفروشم
خاکِ درِ صابرِ ہمہ اکسیرِ خدائی است — یک ذرہ بصد تختِ سلیماں نفروشم

ایں رندی و بدمستیِ حافظ عجبے نیست
دشوار بدست آمدہ آساں نفروشم

---

(۸)

من کہ از عشق رسواے جہاں خواہم شدن　　آستیں افشاں بروں زیں خاکداں خواہم شدن

ایں خیالم بود چوں بینم ورا پرسم ازو　　می ندانستم کہ آں دم بے زباں خواہم شدن

مستم اکنوں ناصحا از غمزۂ ساقی مپرس　　چوں شوم ہشیار در شرح و بیاں خواہم شدن

واعظا بیہودہ ایں زہد و صلاح از من مجو　　من نہ ہرگز در پئے خلد و جناں خواہم شدن

از شراب ناب ساقی چوں طہارت کردہ ام　　از ہمہ خبث و خباثت ور اماں خواہم شدن

حافظا در عشق از جاں صرف کردن چارہ نیست
در تلاشِ بے نشاں، خود بے نشاں خواہم شدن

(۹)

در نمازم چوں نظر افتد بماہ روے تو　　پشت بر قبلہ کنم بینم خم ابروے تو

روے ظاہر سوے قبلہ باطنم لیس سوے تست　　زیں دو روئی خو دم ترمست پیش روے تو

گہ رہ بمیخانہ برم گہ رخت سوے خانقہ　　میگردم ہر جا در بدر، دایم بجست جوے تو

اکنوں کہ دل پژمردہ شد از قیل و قال مدرسہ　　آیم بکنج میکدہ افتم بگفت و گوے تو

چوں ناہدا افسردہ دل تا کے بمحراب دعا　　ایں دم مرا کافی بود طاق خم ابروے تو

صد روزن از سوز دروں در سینۂ خود کردہ ام　　تا بو کہ افتد پرتوے از آفتاب روے تو

حافظ نہ از خاکِ درت محروم می ماند چنیں
بسیار دارد التجا پیشِ سگانِ کوے تو

(۱۰)

بکجا روم ز کویت چہ دوا کنم چہ چارہ　　کہ دلم ز درد خوں شد جگرم ہزار پارہ

ایں زاری دل من کہسار گر ببیند　　چوں موم نرم گردد دلہاے سنگِ خارہ

بیچارہ دیدۂ من رویت چگونہ بیند　　بہزار دیدہ خواہم کہ کنم ترا نظارہ

کمے ترا چہ نسبت کہ بدلبراں بگویم　　تو چو آفتاب تاباں دگراں چو ستارہ

دل خستہ حافظم را تو بسوختی حذر کن
ز چہ خنجر مژہ را تو کشی ز ہر کنارہ

(۱۱)

آمد آں دلبرِ عیار بہ آنی عجبی　　صورت و جاہ و حشم شوکت و شانی عجبی

غمزہ و ناز و کرشمہ ہمہ آں غنج و دلال　　چشم مستے عجبے آفت جانی عجبی

ایں چہ حسن است خدایا کہ بچشم پیداست　　یافتم جملہ ازاں روح و روانی عجبی

یک نظر کرد بما ہم لب عیسےٰ بکشاد　　زندہ ساخت مرا تنگ دہانی عجبی

گشت مقبول خرابات چہ حافظ با دب
مثل او نیست مگر سوختہ جانی عجبی

نمونے کے طور پر زیر نظر مخطوطہ کی سات غزلیں نقل کر دی گئی ہیں۔ ان غزلوں کے مطالعہ کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ صابر گورگانی کو حافظ سے والہانہ حد تک عقیدت تھی، اسی وجہ سے ان کو حافظ کے کلام میں اسرار باطن کی کارفرمائیاں نظر آئیں، ورنہ انصاف تو یہ ہے کہ کیا بلحاظ غزل گوئی اور کیا بلحاظ مضامین تصوف ان بزرگ کا کلام کسی غیر معمولی اہمیت کا حامل نہیں نظر آتا۔ تیرھویں صدی ہجری میں غالب کے علاوہ اور بہت سے شعراء جن میں شیفتہ اور صہبائی بھی شامل ہیں، فارسی میں داد سخن دے رہے تھے۔ زیر نظر مخطوطے کے مطالعے سے اس بات کا بآسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے، کہ اس دور میں فارسی غزل گوئی کے کون کون

سے رنگ رائج تھے، اور اگر اس مخطوطہ کے شاعر کا دوسرے شعرا کے کلام سے موازنہ کرکے اُس زمانہ کی غزل گوئی کے رجحان کا تجزیہ کیا جائے، تو ممکن ہے کہ کچھ نئے گوشے بھی ابھر کر سامنے آئیں، اس لحاظ سے اس مخطوطہ کی اہمیت ہوسکتی ہے، اگر اس مخطوطہ کی ترتیب و اشاعت کا کام کیا جائے، تو تیرھویں صدی ہجری کے ایک فارسی گو شاعر کے کلام کو دستبرد زمانہ سے محفوظ کردیا جائے گا، اس مخطوطہ میں اردو کا بھی کلام ہے، اگر کوئی صاحب ذوق اس حصہ کا تعارف کرائیں تو ایک بڑی ادبی خدمت ہوگی،

(دار المصنفین کی نئی کتابیں)

خریطۂ جواہر

مولانا شاہ معین الدین احمد مرحوم ناظم دار المصنفین کی یہ آخری تصنیف ہے، اس میں مرزا مظہر جان جاناں کی بیاض خریطۂ جواہر کے منتخب اشعار کی تشریح و ترجمہ کے ساتھ خود مصنف مرحوم کے اپنے خیالات بھی درج ہیں، ضخامت :- ۱۲۴ صفحے، قیمت :- ۷۵-۴

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

اس میں عہد مغلیہ سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کی تفصیلات درج ہیں مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن، ضخامت :- ۱۶۰ قیمت :- ۰۰-۵

ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (حصہ دوم)

اس میں ظہیر الدین بابر سے لے کر نور الدین جہانگیر تک کے متعلق دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں ہیں، مرتبہ :- سید صباح الدین عبد الرحمن، ضخامت : ۱۷۲ صفحے

قیمت :- ۲۵-۶

"منیجر"

بَابُ التَّقرِیظِ وَالانتِقَاد

کتاب النبات

از

حافظ محمد نعیم ندوی صدیقی، ایم، اے (علیگ)

تالیف :- ابوحنیفہ - دینوری - مرتبہ :- ڈاکٹر محمد حمید اللہ - تقطیع بڑی نفیس کاغذ نفیس طباعت، ضخامت ۴۴ × ۵، صفحے - غیر مجلد - پتہ - المعہد الفرنسی قاہرہ -

علم نباتات پر عربی میں بکثرت کتابیں تالیف کی گئی ہیں، ابن ندیم کی الفہرست میں متفرق طور پر ایسی دس کتابوں کا ذکر ملتا ہے - لیکن جہاں تک علم ہوسکا ہے، ان میں صرف الاصمعی (المتوفی ۲۱۶ھ) کی کتاب النبات والشجر ہی ابھی تک طبع ہوسکی ہے۔[1] ان کثیر التعداد تصانیف میں ابوحنیفہ دینوری (المتوفی ۲۸۲ھ) کی کتاب النبات کو بھی ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے، بلکہ بعد کے لغت نویسوں نے پودوں اور جڑی بوٹیوں کے ذکر میں جتنی خوشہ چینی دینوری کی یادگار تالیف سے کی ہے، اتنی کسی اور کتاب سے نہیں، چنانچہ لسان العرب ابن منظور، تاج العروس مرتضیٰ زبیدی، معجم البلدان یاقوت، کتاب المخصص ابن سیدہ، العباب صاغانی اور القاموس فیروز آبادی وغیرہ میں دینوری کی تحقیقات کے

---

[1] یہ کتاب مطبعہ یسوعیین بیروت سے ۱۸۹۵ء میں طبع ہوئی - تعداد صفحات ۴۸ -

اقتباسات کثرت سے ملتے ہیں۔

ابوحنیفہ دینوری کا شمار تیسری صدی ہجری کے کبار اور ماہرین فن علماء میں ہوتا ہے[1] ان کو امام بخاری، جاحظ، ابن قتیبہ، اور امام احمد کی معاصرت کا شرف حاصل تھا، ان کے فضل وکمال کے حدود و تاریخ وجغرافیہ، ریاضی وہیئت لسانیات وبلاغت اور طب و نباتات تمام علوم تک وسیع تھے، علامہ سیوطی، یاقوت رومی، عبدالقادر بغدادی اور ابن ندیم سب نے بالاتفاق لکھا ہے کہ۔

انہ من نوادر الرجال جمع	بلاشبہ وہ نادرۂ روزگار لوگوں
بین حکمۃ الفلاسفۃ و	میں تھے حکمت وفلسفہ اور عربیت
بیان العرب ولہ فی کل	کے جامع تھے، اور ان کو ہر فن میں
فن ساق وقدم	تقدم وفوقیت حاصل تھی۔

صاحب معجم الادبار نے ان کو انشاء پردازی کی حیثیت سے جاحظ کا حریف قرار دیا ہے۔ دینوری کی مشہور تصنیف الاخبار الطوال تاریخ کا ایک اہم ماخذ شمار ہوتی ہے، اس جلالت علم وفن کے ساتھ ورع وتقوی اور اخلاق وسیرت میں بھی نہایت عالی رتبہ تھے۔ جمادی الاولی ۲۸۲ھ میں وفات پائی۔ (بعض روایات کے مطابق سنہ وفات ۲۹۰ھ ہے۔)

ابوحنیفہ دینوری کے اشہب قلم نے ہر میدان میں جولانی دکھائی ہے، ذیل میں انکی تصنیفات کی فہرست درج کی جاتی ہے۔ جس پر ایک نظر ڈالنے سے دینوری کی ہمہ جہتی اور جامعیت کا پورا اندازہ ہوجاتا ہے۔

---

[1] بغیۃ الوعاۃ ص ۱۳۲، معجم الادبار ج ۱ ص ۱۲۵، خزانۃ الادب ج ۱ ص ۷۰، الفہرست

کتاب الباءۃ، ما تلحن فیہ العامۃ، الشعر والشعراء، الفصاحۃ، الانواء، فی حساب الدور البحث فی حساب الہند، کتاب الجبر والمقابلہ، البلدان، کتاب البنات، المعارف، الجمع والتفریق، الاخبار الطوال، تفسیر القرآن (۱۳ جلد) کتاب الوصایا، نوادر الجبر اصلاح المنطق، القبلۃ والزوال، کتاب الکسوف[1]

ان میں ابھی تک صرف المعارف اور اخبار الطوال ہی زیور طباعت سے آراستہ ہوسکی تھیں۔ اب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کی تلاش ومحنت سے کتاب البنات بھی شائع ہوگئی ہے، فاضل موصوف کی شخصیت اور علمی خدمات کسی تعارف سے مستغنی ہیں۔ ان کو اردو کے علاوہ عربی، انگریزی، فرانسیسی اور جرمن تمام زبانوں پر یکساں عبور حاصل ہے اور ان سب میں ان کی عالمانہ تصنیفات ذوق شناسان علم سے داد حاصل کرچکی ہیں ڈاکٹر صاحب موصوف نے آج سے پچیس ۲۵ سال قبل دسمبر ۲۹ھ اور پھر جون ۵۰ء کے معارف میں ابوحنیفہ دینوری کی کتاب البنات کا مفصل تعارف کرایا تھا، (جس کا ذکر پیش نظر کتاب کے فرانسیسی مقدمہ میں بھی ہے۔) اور اسی وقت اہل ذوق کو یہ خوش خبری بھی سنائی تھی کہ ان کو مدینہ منورہ میں تین ابواب پر مشتمل اس کتاب کا ایک مخطوطہ دستیاب ہوگیا ہے، اور وہ دینوری کے دوسرے خوشہ چینوں کے اقتباسات یکجا کرکے اس کو مرتب کررہے ہیں۔ مقام مسرت ہے کہ فاضل گرامی کی چوتھائی صدی کی عرق ریزی کا حاصل خوان یغما کی صورت میں اہل علم کی ضیافت طبع کے لیے منصۂ شہود پر آگیا ہے اس کے لیے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا جس قدر بھی سپاس گذار ہوا جائے کم ہے۔

زیر تقریظ کتاب کے آخر میں فاضل مرتب وجامع کے قلم سے فرانسیسی زبان میں

---

[1] یہ فہرست معجم الادبار، الفہرست الاعلام اور بغیۃ الوعاۃ سے تیار کی گئی ہے۔

ایک طویل مقدمہ بھی شامل ہے، جس میں انھوں نے یہ یاد دلایا ہے کہ تیسری ہجری کے نامور مؤلف دینوری نے نباتات پر ۶ ضخیم جلدوں میں ایک دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) نے تالیف کی تھی۔ جس کی نظیر نہ یونانی میں ہے، نہ سنسکرت میں اور نہ دنیا کی کسی اور قدیم زبان میں[1]۔ اس کی جلد سوم اور پنجم ابھی حال میں دریافت ہوئی ہیں۔ باقی ہنوز پردۂ خفا میں ہیں جرمن مستشرق زلبربگ کو حیرت ہے کہ تیسری صدی ہجری میں کوئی مسلمان یہ کارنامہ کیسے انجام دے سکا۔ جب کہ یونانیوں کے لیے یہ ہزار سال میں بھی ممکن نہیں ہوا۔

ابو حنیفہ احمد بن داؤد الاہوزی نے کیا یہ کہ پہلی ۴ جلدوں میں باب وار نباتات کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً پہاڑی پودے۔ میدانی پودے، سمندر کے کھاری پانی میں اگنے والے خوشبودار، بدبودار، مسواک کے طور پر استعمال ہونے والے وغیرہ، پھر آخری ۲ جلد میں حروف ہجا پر نباتات کی ایک مکمل اور خصوصی عربی لغت لکھی۔

جلد پنجم کا وہ حصہ جس میں الف سے ز تک نباتات کا تذکرہ ہے، استانبول کے مخطوطہ کی اساس پر ۱۹۵۳ء میں سویڈن کے مستشرق برن ہارڈ لیوین نے ایڈٹ کیا۔ (ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے کتاب النبات کے اپنے مرتبہ زیر نظر نسخہ کے آغاز میں اس جلد کی فہرست باعتبار حروف معجم درج کر دی ہے۔) ڈاکٹر برنہارڈ لیوین نے اپنی مذکورہ کتاب کے مقدمہ میں حمید اللہ صاحب کے کام کو سراہا، اور ان کے تعاون کا شکریہ ادا کیا ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ کی دیدہ ریزی اور کاوش و محنت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ انھوں نے متاخرین کی کتابوں مثلاً لسان العرب، تاج العروس، المخصص، المحکم العباب اور المفردات لابن بیطار وغیرہ کی مطبوعہ و مخطوطہ تیس چالیس ضخیم مجلدات کے ہزاروں

[1] یاقوت وغیرہ نے لکھا ہے۔ لم یصنف فی معناہ مثلہ

صفحات کو سطر بہ سطر پڑھا۔ اور ان میں جہاں کہیں "قال الدینوری" ..... نظر آیا، اس اقتباس کو نقل کر لیا۔ جس کے نتیجہ میں خود فاضل مرتب کے الفاظ میں بحذف مکررات کوئی دو ہزار فل سکیپ صفحات ہوئے۔" ان میں آخری حصہ یعنی س سے ی تک کی ابجدی لغت پانچ سو صفحے میں آئی۔ اسی آخری حصہ کو فرانسیسی حکومت نے اپنے مصارف پر چھاپا ہے۔ جو اہل علم کے شکریہ کی بجا طور پر مستحق ہے۔

اس کتاب کی پہلی جلد میں جو ڈاکٹر برنہارڈ لیوین نے مرتب کی تھی الف تا ز کے ۴۸۲ پودوں کا ذکر تھا۔ اور زیر نظر کتاب حرف س سے شروع ہوتی ہے۔ چنانچہ ۴۸۳ نمبر کا پہلا پودا "ساج" ملتا ہے، جس کے بارے میں مصنف رقمطراز ہے۔

والساج خشب یجلب من	ساگوان ایک لکڑی ہے جو ہندوستان
الہند واحدتہ ساجۃ	سے لائی جاتی ہے اس کا واحد ساجہ
والساج شجر یعظم جداً	ہے، اس کا درخت بہت بڑا ہوتا
ویذہب طولاً وعرضاً	ہے۔ طول میں بھی اور عرض میں بھی
ولہ ورق امثال التراس	اس کے پتے دیلم والوں کی ڈھالوں
الدیلمیۃ یتغطی الرجل	کے سے ہوتے ہیں۔ اس کا ایک
بورقۃ منہ فتکنہ من المطر	ہی پتہ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اگر کوئی
ولہ رائحۃ طیبۃ تشاکہ	شخص اسکو چھتری بنائے تو بارش
رائحۃ ورق الجوز مع	سے بچ سکتا ہے، اس کے پتوں
رقۃ ونعمۃ۔ حکاہ ب ج	کی بو جوز کے پتے کی بو سے مشابہ
والفیل معجبۃ بورقۃ	ہوتی ہے۔ لیکن زیادہ رقیق اور

ورق الموز ومنبته بالهند والزنج (لسان وتاج)۔
سوج مخصص ۱۱/۱۹۷
صیدنة البیرونی: ساج ورق ۲، الف

زیادہ ملائم، جیساکہ ابوحنیفہ دینوری نے بیان کیا ہے، ہاتھی اس کے اور کیلے کے پتے پسند کرتے ہیں
ساگوان ہندوستان اور بلاد زنج (حبش) میں اگتا ہے۔ لسان العرب تاج العروس مادہ سوج۔ مخصص لابن سیدہ جلد ۱۱ ص ۱۹۷۔ صدنة البیرونی لفظ ساج۔ مخطوطہ بروصہ ورق ۲، الف۔

مختلف مصادر میں جو خفیف اختلاف الفاظ ہے، وہ بھی حاشیہ میں بتایا گیا ہے کتاب النبات کے زیر نظر حصہ میں آخری پودا ۱۲۰۱ نمبر کا ہیر ہے، آخر کتاب میں کئی انڈکس بھی شامل ہیں۔ جو مرتب کی محنت وزحمت اور ساتھ ہی جدید طریقہ ترتیب وتدوین سے ان کی مہارت وواقفیت پر شاہد عدل ہیں۔

اس کتاب کے مقدمہ ہی سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے پاس ابھی چار جلدیں اور ہیں، جو دینوری کے اقتباسات پر باب وار مشتمل ہیں، ان میں سے دو سو صفحے تو کتاب الانواء (یعنی بارش کے ستاروں) کے متعلق ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس ایک ہزار سے زائد پودوں کی تصویریں بھی ہیں جو پرانے عربی مخطوطات سے حاصل کی گئی ہیں، اگر یہ تصویریں البم کے طور پر شائع ہوجائیں تو مختلف پودوں کو پہچاننے میں بڑی مدد مل سکے گی، زیر نظر کتاب کے تمام محاسن کے

باوجود ایک کمی یہ محسوس ہوتی ہے کہ جس طرح کتاب کے آخر میں ۵ صفحات کا ایک طویل مقدمہ فرانسیسی زبان میں شامل ہے، اس طرح اگر شروع میں عربی زبان میں بھی اس کا خلاصہ دیدیا جاتا تو فرانسیسی زبان سے ناواقف لوگ بھی اس سے مستفید ہوسکتے۔ ڈاکٹر صاحب نے ستر سال کی عمر میں جس تلاش وتحقیق اور محنت وکاوش کا ثبوت دیا ہے۔ وہ جوانوں کے لیے بھی باعث عبرت وبصیرت ہے، خدا دنیائے علم وفن کو تادیر اس چراغ سے روشن رکھے۔

معارف کے گذشتہ سالوں کے مکمل فائل اور متفرق پرچے

معارف علوم ومعارف کا گنجینہ، مشرقی ومغربی علوم وفنون کا دائرۃ المعارف اور ہزاروں علمی، ادبی، تنقیدی تاریخی، فقہی، دینی مضامین، اور تحقیقات کا ایک دلآویز مجموعہ ہے، اس کی اسی دلآویزی، اور اہمیت کی بنا پر اس کا آوازۂ شہرت ہندوستان کی چہار دیواری سے گذر کر یورپ، وامریکہ اور ایشیا کے دوسرے ملکوں تک پہنچ گیا ہے مشرقیات کے جن غیر مسلم فضلاء نے غلط فہمی کی بنا پر جب جب بھی اسلام پر اعتراضات کئے تو سید صاحب اور ان کی نگرانی میں دار المصنفین کے رفقاء محققین نے ان کے دندان شکن جوابات اسی کے صفحات پر دئے ہیں، متفرق پرچوں کے علاوہ حسب ذیل رسالوں کے فائل تو بالکل مکمل موجود ہیں۔ ۱۹۳۰-۱۹۳۵-۱۹۳۷-۱۹۳۸-۱۹۳۹-۱۹۴۱-۱۹۵۱-۱۹۵۳-۱۹۵۴-۱۹۵۵-۱۹۶۹-۱۹۷۳-ان کو خرید کر اپنے کتب خانہ کی رونق بڑھائیں۔

"منیجر"

مطبوعاتِ جدیدہ

مذہب اور جدید ذہن مرتبہ۔ جناب ڈاکٹر مشیر الحق صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی صفحات ۱۲۰ مجلد، قیمت۔ ۱۶ پیسے۔ پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵۔

یہ کتاب مندرجۂ ذیل چھ مضامین کا مجموعہ ہے، (۱) مذہب اور جدید ذہن (۲) فتاوی اور عصری مسائل۔ (۳) شاہ عبدالعزیزؒ کے فتاوائے دارالحرب کا سماجی پس منظر، (۴)، مسلم پرسنل لا اور ہندوستانی عدالتیں، (۵) پاکستان اور قانون شریعت (۶) ملایا میں قانون شریعت، آخری دو مضامین میں دو مسلم ملکوں پاکستان اور ملایا میں قانون شریعت کی موجودہ صورت بیان کی گئی ہے۔ ملایا میں مقامی حالات اور ضروریات کے لحاظ سے کہیں کہیں کچھ اضافے کئے گئے ہیں، یا پابندیاں لگائی گئی ہیں جیسے اسلامی قانون سازوں کی شریعت کے نفاذ میں احوال وظروف کی رعایت، ممکن ہے یہ دوسرے ممالک میں بھی فقہا اور مقننین کے لیے غور وفکر کی راہیں دکھائے۔ پاکستان میں شرعی قوانین کے نفاذ میں حکمرانوں کی پہلو تہی کا ذکر ہے، اور حکومت اور اس کے ہمنوا طبقہ کا نقطہ نظر بھی پیش کیا گیا ہے، اچھا ہوتا کہ اس کے ساتھ اس نقطۂ نظر کے مخالف علماء اور قانون دانوں کے دلائل پیش کر دئے جاتے لیکن شاید سرکاری حلقہ کا استدلال

اتنا کمزور محسوس ہوا کہ ان کی تردید کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ چوتھے مضمون میں ہندوستانی عدالتوں کے ذریعہ مسلم عورتوں کے فسخ نکاح کا ذکر ہے، اس میں اُس اصلاحی مسودہ قانون کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے، جو محمد احمد کاظمی مرحوم نے علماء کے مشورہ سے مرتب کیا تھا، لیکن سنٹرل اسمبلی نے منظوری کے وقت مسلم جج کی قید نکال دی تھی، اس کی بنا پر وہ قانون فقہ اسلامی کے مطابق قابل عمل نہیں رہ گیا، اس کے بعد خلع سے متعلق کیرالہ ہائی کورٹ کے ایک اہم فیصلہ کا تذکرہ ہے، چیف جسٹس، وی۔ آر۔ کرشنا آئر نے اس فیصلہ کے سلسلہ میں اسلام کے قانون ازدواج کا مطالعہ کرکے اس کی جن خوبیوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ دوسرا اور تیسرا مضمون فتاوی کے متعلق ہے۔ ان میں پہلے فتوی کا مفہوم، اس کی تاریخ، اس کے مجموعوں کی ترتیب وتالیف اور ۱۹ ویں ۲۰ ویں صدی کے فتووں میں درج شدہ مسائل کی نوعیت وخصوصیات بیان کرکے موجودہ مسائل اور فتاوی میں استحسان اور مفاد عامہ کو مدنظر رکھنے کی ضرورت ثابت کی گئی ہے، دوسرے میں شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے ان فتووں پر گفتگو ہے، جن میں برطانوی دور کے ہندوستان کو دارالحرب کہا گیا ہے، مصنف کے خیال میں یہ فتوے اس زمانہ کے سماجی ومعاشی حالات کے تحت دئے گئے تھے، ان کا منشا انگریزوں سے جہاد اور ہندوستان سے ہجرت نہ تھا بلکہ بدلے ہوئے سیاسی ومعاشی حالات میں مسلمانوں کو کچھ مشورے دینا تھا، شاہ صاحب ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کو مسلم حکومت کا بدل نہیں سمجھتے تھے، لیکن چونکہ اس کو بدل کر پھر اسلامی حکومت قائم کرنا ممکن نہیں نظر آتا تھا، اس لیے ضرورت کی بنا پر اس کے اندر انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بارہ میں کچھ مشورے دئے تھے، کتاب کا پہلا مضمون یعنی مذہب اور جدید ذہن سب سے اہم ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کو نہ موجودہ سائنس سے کوئی خطرہ ہے نہ جدید مشاہدات وایجادات نے مذہب کی ضرورت واہمیت کو کم کیا ہے، ان دونوں میں کوئی تضاد اور تصادم بھی نہیں ہے، انسان فطرۃً مذہبی ہے۔ آج بھی وہ مذہب سے برگشتہ نہیں ہے البتہ اسلام کو

مسلمانوں کی غیر سائنسی ذہنیت سے خطرہ ہے، لیکن اس مضمون میں مصنف کے بعض خیالات میں الجھاؤ اور تضاد ہے، جب انکے نزدیک اسلام ہی جامع، مکمل اور خدا کا پسندیدہ دین ہے تو اس کے اصول و احکام سے انحراف کرنے والا کوئی شخص مسلم کس طرح ہو سکتا ہے؟ نیز قرآن کے ابدی حقائق و مسلمات اور اسکی بنیادی تعلیمات ہر ہر صدی میں کس طرح بدل سکتی ہیں، ماضی میں اسلام کی جو تشریح و تعبیر کی گئی ہے اسکو یکسر نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے، عہد رسالت کی تعبیر و تشریح کو بھی زمانی و مکانی اثرات سے متاثر مان لیا جائے تو پھر دین کی کوئی محکم بنیاد باقی نہیں رہ جاتی، اور مدعیان تغیر و اصلاح وہی صدائیں بلند کرنے لگیں گے جن کا ذکر وہ پاکستان کے تجدد پسندوں کی زبان سے کر چکے ہیں، اگر جدید ذہن "صرف" رسوم و روایات کا منکر ہے تو اہل مذہب اسمیں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے لیکن اختلاف وہاں ہوتا ہے جب رسوم و روایات کے دائرہ کو اسقدر وسعت دیجاتی ہے کہ مذہب کے اوامر و نواہی اسکی زد میں آجاتے ہیں، اشتراکیت صرف ایک معاشی نظام نہیں ہے بلکہ اسکے پیچھے خالص مادی عقیدہ ہے، لیکن ایسے مادہ پرستوں کو بھی اگر مصنف مذہب کا منکر نہ سمجھیں تو یہ ان کے حسن ظن اور رواداری کی ایسی کیفیت ہے، جس کی تائید نہیں کیجا سکتی ہے، اسلام کے اصولی و اعتقادی امور کو اجتہاد و تقلید کے مسائل سے بھی خلط ملط کر دیا گیا ہے، "وجدنا علیہ آباءنا" کی پھبتی فقہی و جماعتی عصبیت میں گرفتار لوگوں پر تو کسی حد تک بجا ہو سکتی ہے، لیکن ائمہ مجتہدین فی الدین پر اسکا اطلاق بے محل ہے، مختلف مسالک فقہ سے تعلق رکھنے والے اپنے ائمہ کو شریعت ساز نہیں سمجھتے بلکہ کمال علم و تقوی کی بنا پر ان کے اجتہاد پر اعتماد کرتے ہیں، اور ان سے اللہ و رسول کے احکام معلوم کرتے ہیں مجددین کے ذکر میں بھی کس قدر مغالطہ آمیزی ہے، جب انکا کام بقول مصنف مروجہ اسلام کے خلاف آواز اٹھانا ہے تو پھر اسکا مطلب اسکے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ اسی چودہ سو سال پہلے کے اصل اسلام کو جس پر رسوم و رواج اور بدعات و خرافات کا غبار جم گیا تھا از سر نو نمایاں کر کے پیش کرتے ہیں، اسیطرح بعض اور مسائل میں بھی ترتیب مقدمات کی غلطی کی بنا پر مصنف نے جو نتائج نکالے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں مصنف کا انداز تحریر سنجیدہ ہے اور انھوں نے ان مضامین کے ذریعہ جمود پسند ذہنوں میں تحمل پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، ممکن ہو، ارباب بصیرت حالات کا جائزہ لیکر زیادہ بہتر اور صحیح تر نتائج اخذ کر سکیں اور اس دور کے مشکل مسائل کو کتاب و سنت کی روشنی میں مجتہدین سلف کی بحث و بصیرت کو وسیلہ بنا کر حل کر سکیں۔

"ض"

جلد ۱۱۶ ماہ اکتوبر ۱۹۷۵ء مطابق ماہ شوال المکرم ۱۳۹۵ھ عدد ۴

مضامین

مقالات

بَابُ التَّقرِیظِ وَالاِنتِقَاد